عالمگیر اسلامی تصوّرات

دنیا کی موجودہ بے چینی کا علاج اور سسکتی ہوئی انسانیت کی نجات صرف اسلام میں ہے اور انسانیت کیلئے پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی زندگی ہی صحیح اور مکمّل نمونہ ہے

مصنّفہ
کانٹ ہنری دی کاستری

عربی ترجمہ
احمد فتحی زاغلول پاشا

اردو ترجمہ
عبدالوہاب ظہوری

نفیس اکیڈیمی
بلاسس اسٹریٹ - کراچی نمبر ۱

قیمت تین روپیہ چار آنہ

طبع اول ــــــــ فروری ۱۹۴۹ء

مطبوعہ

دین محمدی پریس - میکلوڈ روڈ - کراچی - پاک

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پاکستان آنے کے بعد

چودھری محمد اقبال سلیم گاہندری

اسلام ایک عالمگیر اخوت کا پیام دیتا ہے، وہ پیام جس میں اسود و احمر اور سامی و آریائی سب برابر ہیں، اسلام ایک ہی دین ہے جو سارے جہان، سارے زمانے اور ساری انسانی آبادی کیلئے ہے، تنگ نظر اور وطن پرست اتنی بلند چیز سے گھبراتا ہے بالکل اسی طرح جیسے شپرہ آفتاب عالم تاب کی کرنوں سے اور مجرم عدالت کی چہار دیواری سے، اسی لئے اسلام کے عالمگیر تصورات پر طرح طرح کے اعتراضات کئے جاتے ہیں، کبھی تو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ عرب امپریلزم ہے، اور کبھی طبقہ واری تسلط سے تعبیر کیا جاتا ہے، کبھی اسے ناممکن بتایا جاتا ہے اور کبھی ناقابل عمل ایسے بہت سے اعتراضات عیسائیوں کی طرف سے ہوتے اور ہوتے رہتے ہیں، یورپ کے ایک عیسائی عالم نے ان اعتراضوں کا دنداں شکن جواب دیا ہے اور دلائل و براہین کی روشنی میں اسلام کے عالمگیر تصورات کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ اسلام صرف اسلام ہی دنیا کی نجات کا ذریعہ ہو سکتا ہے

اور دنیا کی موجودہ بے چینی کا علاج اور سسکتی ہوئی انسانیت کی نجات صرف اسلام میں ہے اور انسانیت کے لئے پیغمبر اسلام کی زندگی ہی صحیح اور مکمل نمونہ ہے۔

یہ کتاب تبلیغی نکتۂ نگاہ سے انتہائی مفید ہے مصر کے قابل فخر مفکر احمد فتحی زاغلول پاشا نے عربی میں پیش کرکے اہل عرب کو مستفیض کیا۔ اور اب اُردو داں طبقے کے لئے جناب عبدالوہاب صاحب ظہوری نے ترجمہ کیا جسے ہم آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہے ہیں۔

میں ایک طویل عرصہ بعد اس قابل ہو سکا ہوں کہ اپنے اشاعتی پروگرام کو روبہ عمل لا سکوں۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں میرے آبائی وطن گا ہندران ضلع جالندھر کے سینہ پر بے رحموں کی کدالیں چلیں۔ اور اس قدر خون بہایا گیا کہ دوآبہ جالندھر دریا کے خون میں ڈوب گیا۔ ابھی میرے کانوں میں اپنے عزیز و اقارب ساتھیوں اور ان کے معصوم بچوں کی دردناک چیخیں گونج رہی تھیں۔ کہ ستمبر ۱۹۴۸ء میں میرا کاروباری مرکز حیدر آباد (دکن) ہندوستانی سنگینوں اور ریاکاروں کی زد میں آگیا۔ اب اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ میں اسلام کا نظام حیات، اسلامی نظریہ اجتماع، حکومت الٰہیہ، تشریحات پاکستان اور تصوّرات پاکستان جیسی کتابوں کا ناشر تھا۔ اس لئے کفر کی نظر مجھے ایک مجرم کے سوا کیا دیکھتی۔ بہرحال خدا کا شکر ہے۔ کہ زندہ و سلامت مع اہل و عیال ۲۰ نومبر ۱۹۴۸ء کو اپنی مملکت پاکستان میں آپہنچا۔ کیا لا سکا اور کیا چھوڑ آیا نہ کہنے کی تاب نہ کہنے سے حاصل۔

دیباچہ

احمد فتحی زغلول پاشا

(مترجم عربی)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَمَنْ وَالَاہُ

ایک فرانسیسی کتاب میرے ہاتھ لگی جس کو کانٹ ہنری دی کاسٹری نے ۱۸۹۶ء میں دین اسلامی کے متعلق تالیف کیا تھا، جب میں کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھ کر فارغ ہوا تو خود کو اس کتاب کا ترجمہ کرنے پر تیار مائل پایا، چنانچہ میں نے بغیر کسی دشواری اور ناگواری خاطر کے کتاب کا پورا ترجمہ کر ڈالا، پھر میں نے نظر ثانی کی اور ترجمہ کو اصل کتاب سے ہم آہنگ کر کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ترجمہ حرف بہ حرف اصل کتاب کے مطابق ہے، اس کے بعد مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ اس ترجمہ کو طبع کر کے عربی زبان بولنے والوں کیلئے

معلومات کا ذخیرہ فراہم کر دوں، میں نے اپنے ایک دوست کے روبرو ترجمے کے بعض مقامات پڑھ کر سنائے تو اُس نے مجھ پر اعتراض کیا اور اِس کتاب کے طبع و نشر کے خلاف خیال ظاہر کیا۔ اُس کا استدلال یہ تھا کہ ہرچند یہ کتاب انتہائی تحقیقات اور حد درجہ دقیق معلومات پر مشتمل ہے، لیکن مؤلف کو مجبوراً ان الزامات اور بیہودہ باتوں کو جن کے معتقد گذشتہ زمانے میں مسیحی تھے یا اُن چیزوں کا خیال ان کے دِل میں جاگزیں ہو گیا تھا، ذکر کرنا پڑا ہے، اور اِس قسم کے امور کا تذکرہ خواہ کتنا ہی تردید کے لیے ہو مگر نفوس کے لیے ناخوشگوار اور پڑھنے والوں کی طبیعت پر گراں اور موجب اعتراض ہے، اس کا یہی پہلو ہے جو مسلمانوں کے جی کو نہ بھائے گا۔ مگر یہ خیال میرے دل میں کبھی نہ ہوا اور میرے ذہن میں یہ بات نہ گزری کہ کسی کو اِس کتاب میں ان امور کے ذکر پر کوئی اعتراض ہوگا حالانکہ یہ امور مؤلف کی طرف سے باوجودے کہ وہ مسیحی ہے اِس عنوان سے کہ اُن میں واقعیت کا رنگ جھلکتا ہو پیش نہیں کیے گئے بلکہ اس لحاظ سے بیان کیے گئے ہیں کہ یہ تمام خرافات و موہومات ہیں جو اُس زمانے سے عیسائیوں کے ذہنوں میں جاگزیں ہو گئے اور نتیجۃً اُن کے صفحۂ خیال میں مسلمانوں کی دھندلی اور ڈراؤنی تصویریں مرتسم ہو گئی ہیں، مؤلف کی آرزو یہ ہے کہ ان داغدار تصویروں کو موجودہ زمانے کے دماغوں سے محو کر دے اِسی لیے اس نے برہانی اور الزامی دلیلوں اور قطعی اِستدلال سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ موہوم تصوّرات ہیں اور حقیقت سے اُن کا کچھ لگاؤ نہیں، بالآخر مؤلف نے عیسائیوں کے نفوس میں اِن موہومات کے موجود ہو جانے کے اسباب پر

روشنی ڈالی ہے اور اپنی قوم کو اس امر کی تحریص و ترغیب دلائی ہے کہ ان قبیح نقوش کو حقیقی اسلام کی شکل و صورت میں تبدیل کر دیں اور اسلام نے خیر و اصلاح کی جو دعوت دی ہے اس پر غور کریں۔

بنا بریں ترجمہ کی تاخیر کا باعث یہ نہ تھا کہ میں نے اس دوست کی رائے پر بھروسہ کر لیا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں چاہتا تھا کہ دوسرے اشخاص سے بھی اس معاملہ میں مشورہ کر لوں، مشورہ حاصل کرنے کے بعد میں نے دیکھا کہ میرے مخالف دوست کے مقابلہ میں دوسرے رفقاء اس کتاب کے ترجمہ کی اشاعت کے ہمنوا ہیں، بعض آفریں کہتے ہیں اور بعض تو اس کو طبع کرنے کا حکم صادر کرتے ہیں بالآخر طبعی طور پر کثیر احباب کی رائے ایک شخص کی رائے پر غالب آگئی بالخصوص اس ایک شخص کی رائے مستند نہ تھی جو صرف یہ کہتا تھا کہ ممکن ہے کوئی معترض پیدا ہو جائے اور ہم کہتے ہیں کہ شاید پیدا نہ ہو، اگر کوئی معترض پیدا بھی ہو جائیں تو ان کی تعداد کم ہو گی، اگر مولف نے جن موہومات و خرافات کو ذکر کیا ہے بیان نہ کرتا اور ان کے غلط ہونے پر تنبیہ نہ کرتا اور ان کے خلاف کوئی برہان نہ پیش کرتا تو یہ توہمات اس کی قوم کے ذہنوں میں مرکوز ہو جاتے اور ہم اور ہمارا پیغمبر ان کی نظر میں اسی طور پر باقی رہتے جیسا کہ اگلوں نے خیال کر لیا تھا اس کام کو مولف نے پورا کیا اور اپنی حسب استطاعت خدمت کی ہمارا فرض ہے کہ مولف کا بقدر امکان شکریہ ادا کریں، ہمارا کامل تشکر یہ ہے کہ ہم اس کی کتاب کو ہماری قوم میں منظر عام پر لے آئیں، لیکن مولف کی اجازت کے بغیر اس کی نشر و اشاعت پر اقدام

نہیں کرنا چاہتے، اس لیے ہم نے ان سے اجازت مانگی تو انہوں نے ازراہِ کرم ہماری درخواست قبول کر لی، ہم اس قبولیت کے علاوہ اس کے اُن اقوال و بیانات کے جن کو مؤلف نے اس کتاب میں ذکر کیا ہے اور اُن کی تردید بھی کی ہے اور اُن کے غلط ہونے کو برہان و دلیل سے ثابت کیا ہے کمال تشکر و امتنان کا اظہار کرتے ہیں، ممکن ہے کہ یہ بیانات بعض کو ناخوشگوار ہوں لیکن اس کتاب کی نشر و اشاعت کے فوائد کا لحاظ کرتے ہوئے اُن کو نظر انداز کر دیا جائے گا۔ جس شخص کو فائدہ سے غرض اور مفید ماخذ کی جستجو ہے اس کے لیے یہ سزاوار نہیں کہ وہ اُس نفرت و بیزاری پر توجہ کرے جو ممکن ہے بعض قارئین سے حاصل ہو، کیوں کہ اگر قارئین انصاف کی نظر سے اس کتاب کو پڑھیں گے تو اُن کو کوئی بیان ناگوار خاطر نہ ہوگا۔

علاوہ بریں میری قوم کو اس پر کامل اعتماد و یقینِ کلی ہے کہ میرا ارادہ نیک ہے اور میرا مقصد اس امر کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ ہماری غیر قوم کے درمیان ایک ایسا فرد پیدا ہوتا ہے جو ہماری جانب سے مدافعت پر کمربستہ ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ حقائق کا ذکر کرے اور صحیح تاریخی واقعات کو نقل کر کے اپنی قوم کے اعتقاد کو جو ہماری نسبت ہے غلط ٹھہرائے اور اُن کی غلطی و درستی کو اُن کے رد و بدو بیان کرے، ہمارا فرض ہے کہ مستشرقین نے ہماری نسبت جو کچھ کہا ہے اور مدافعین نے ہماری طرف سے جو کچھ مدافعت کی ہے اُس کو سمجھیں ——— کاش یہ مدافعین ہماری قوم

کے افراد میں سے ہوتے ______ غلط اور صحیح رائے کے درمیان امتیاز کریں
دوسروں کو ہم پر طعن و تشنیع کرنے کا موقع نہ دیں، جس شخص نے محنت و جانفشانی
سے علمی ذخیرہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے اس کی قدر کریں اور اس کو غور سے
دیکھیں، ہمارے ہاتھوں میں خدا کی کتاب ہے اور مولف نے جو پیرایۂ کار
اختیار کیا ہے اس کی طرف قرآن مجید بہترین رہنمائی کرتا ہے، کیوں کہ
اس نے بعض مذاہب و معتقدات کو بجنسہا ہمارے روبرو پیش کر دیا ہے
پھر کمال وضاحت سے ان کا رد کیا ہے، علمِ اصول و کلام میں سابقہ بزرگوں
کی کتابیں ہمارے سامنے موجود ہیں، یہ سب باطل مذاہب کو تفصیل سے
بیان کرتے اور ان کا رد کرتے ہیں، ہمارے بعض علماء متقدمین مذاہب
باطلہ کو نقل کرنا ضروری سمجھتے تھے تاکہ ان کو پڑھنے والا اور ان سے واقف
کار ان کی تردید دلیل و حجت سے کرنے پر قادر ہو جائے، جب اہل مذاہب
کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے اصولوں اور مسلکوں کو ثابت کرنے کے لیے دوسروں
کے مذاہب و عقائد پیش کرتے ہیں حالاں کہ ان مخالف آرا و نظریات کی
نشر و اشاعت درحقیقت خطرہ سے خالی نہیں۔ گو ان کے مبادی و مقدمات
فاسد و باطل ہیں مگر ان کے ثبوت میں ایک قسم کی دلیل و برہان قائم ہو چکی
ہے، تو اس کا حال کیا ہوگا جس کو ہمارے مخالفین نے قصداً یا سہواً اپنے
خاص اغراض کی خاطر ہمارے متعلق خلاف واقعہ امور کو بیان کیا ہے، میں
سمجھتا ہوں کہ کوئی شخص اس کا مخالف نہ ہوگا کہ مخالفین نے اسلام کی بابت
جو کچھ بیان کیا ہے اس کا نقل کرنا اور ان کے اقوال کا پرچار کرنا نہایت

ضروری ہے اگر اوّل الذکر سے مقصد تردید ہے تو اس کی غرض وغایت اُن چیزوں سے واقفیت ہونی چاہیئے جن کو مخالفین ہماری طرف منسوب کرتے ہیں اس کا دوسرا انجام یہ ہوگا کہ مخالفین نے جن خلاف امور عقائد و تصورات کا گمان کرلیا ہے اس تردیدی بیان پر خاموش ہوجائیں گے، یہی نتیجہ اکابر عقلاء کا مطمح نظر اور جلیل القدر علماء کے لیے پسندیدہ ہے۔

علاوہ بریں عیسائیوں نے ہمارے بارے میں یا ہمارے دین یا پیغمبر اسلام کے متعلق جو اعتراضات کئے ہیں جب وہ ہمارے سامنے آجائیں تو ہم اپنے نفوس کی طرف رجوع کریں اور غور و خوض کے ساتھ یہ دیکھیں کہ آیا ان کے اقوال و بیانات ہمارے افعال و کردار کے ساتھ ہم آہنگ ہیں یا نہیں اگر وہ مطابق ہیں تو ہم جانتے ہیں کہ اس قسم کے افعال ہماری اساس دین کے موافق نہیں ہیں چنانچہ حقیقت بھی یہی ہے، اس لیے ہم ایسے افعال سے دور رہنے کی کوشش کریں اور اسلام کے حقیقی اصولوں کی طرف رجوع کریں کسی حال میں بھی اس اصل الاصول سے روگردانی نہ کریں، اگر اُن کے اقوال ہمارے اعمال کے مخالف ہوں تو ہم سمجھتے ہیں کہ اُن کے ان الزامات میں کوئی خاص غرض پوشیدہ ہے۔ اس لیے ہم ایسا کام کریں جس سے اُن کے دلوں سے یہ وہم زائل ہوجائے، یا وہ اپنی غرض کو جو ہمارے متعلق ہے بدل دیں یہ لوگ بھی جس وقت یہ مشاہدہ کریں گے کہ ہم اس عادلانہ طریقہ کے پابند اور راہِ راست پر کاربند ہیں تو بلا شک و شبہ اپنی ناجائز خواہشات کو چھوڑ دینگے اس حقیقت سے انکار نہیں کرنا چاہیئے کہ ہماری ہمتیں اور ہمارے عزائم

اِس امر سے قاصر و کوتاہ ہیں کہ ہم غیر قوموں کے اُن عقاید کی تلاش و جستجو کریں جو وہ ہمارے متعلق رکھتے ہیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے شخص کو مقرر کر دیا ہے کہ وہ ہمارے بجائے اِسلامی عقیدہ میں بحث کر کے ہماری طرف سے شبہات کا رد کرتا ہے کیا اُس کی محنت اور جانفشانی اور اُس کا کارنامہ اِس قابل نہیں کہ ہم اس کو بطیب خاطر قبول کریں اور اس کی اِس کارگزاری کی نسبت رضامندی کا اظہار کریں! اس کی تحقیقات کو ہمارے ابناء قوم کے درمیان پھیلائیں تاکہ اُن سے تمام فائدہ اٹھائیں؟ اِس قسم کے کاموں کا تو تقاضا یہ ہے کہ ہم خود اِس میں دلچسپی لیں، اِس سے بہتر اور کیا صورت ہو سکتی ہے کہ آدمی اپنی مصلحت خود اپنے ہاتھ میں لے اور اس کے ساتھ ساتھ ہم اُن اشخاص کے حق کو ملحوظ رکھیں جنھوں نے ہماری رہنمائی کی ہے اور اُن کے گراں قدر کام کا انکار نہ کریں۔

میں نے دیکھا کہ مؤلف نے عیسائیوں کے غلط بیانات کو تلاش و تحقیق سے نقل کیا ہے، اُن کو عدل و انصاف کے پیمانوں سے ناپ کر دیکھا ہے تردید کے وقت اپنے وجدان و ذوق پر کاربند ہو کر تنقید و تبصرہ۔ اور تاریخی واقعات سے اِستشہاد کے موقعہ پر اپنی عقل و فکر کے زاویہ سے جانچ پڑتال کی ہے۔ اور اُن تمام طریقوں سے اپنے زمانے کے تمام مؤلفین پر سبقت لے گیا ہے، اِس لیے مجھ پر یہ امر روشن ہو گیا کہ مؤلف کی اصلی غرض بہرحال حقیقت کی نقاب کشائی ہے، کتاب کے بعض مقامات میں اس کا بیان شرعی احکام سے میل نہیں کھاتا ہم اِس لیے اِس سے باز پرس نہیں کرتے کہ

ممکن ہے کہ اُس نے بعض ناقلوں کے اقوال پر اعتماد کر لیا ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض مذاہب کے مطابق جن سے میں ناواقف ہوں اس کا بیان صحیح ہو؛ بنابریں میں نے حاشیہ میں علیحدہ اشارات نہیں لکھے، میری آرزو یہ تھی کہ ترجمہ تمام تر اصل کتاب کے مطابق ہو جائے، تاکہ پڑھنے والوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ مؤلف نے کیا چاہا ہے اور کیا لکھا ہے؛ یہی ہمارے لیے کافی ہے کہ وہ طلبگارِ حق تھا، اگرچہ اس کے بعض عقائد میں کوئی ایسی چیز نظر آئے جس کو ہم غلطی پر محمول کر سکتے ہیں مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتقادات و اعمال اور اخلاق کی تعبیر و حکایت میں جو کچھ اس نے لکھا ہے ممکن ہے اس میں غلطی کا احتمال بھی ہو، علاوہ بریں قارئین ترجمہ کی نظر سے یہ امر اوجھل نہ رہے کہ یہ کتاب اس لیے لکھی گئی ہے کہ مؤلف کی قوم کے مابین رواج پذیر ہو، اس لیے مؤلف کو لازمی طور سے ان اشخاص کے اقوال و افکار کا جائزہ لینا پڑا جن کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے، اس کا جائزہ لینے کے بعد اُسے مجبور ہونا پڑا کہ بعض حقائق ثابتہ کو احتمال و امکان کی صورت میں پیش کرے؛ چنانچہ اس نے جو خط مجھے لکھا ہے اور اس میں ترجمہ کی نشر و اشاعت کی اجازت دی ہے اسی مفہوم و مقصد کی طرف اشارہ کیا ہے، نیز میں اس کے ساتھ بحث و مباحثہ کرنا نہ چاہا مبادا اصل غرض و غائت رائگاں جائے یا معاملہ ایسے شخص کے انکار کی صورت اختیار کرے جو خوشگوار مقصد کا حامل ہے!

میں یہاں ان نقائص کا ذکر نہیں کرتا جو ہمارے اندر موجود ہیں مثلاً یہ کہ منظم کوششوں کی طرف سے ہمارے جذبات و تحریکات پست اور علوم و فنون

میں بحث و تحقیق کی قوت معطل ہو چکی ہے، جن اسلامی احکام پر عمل کرنے کی ہم کو دعوت دی گئی تھی ان کو ہم نے پس پشت ڈال دیا، دین میں نئی نئی چیزیں ٹھونس دینا ہمارا دستور، فرائض و واجبات پر عمل نہ کرنا ہمارا وتیرہ، نواہی و منکرات سے پرہیز نہ کرنا ہمارا طریقہ اور اسلام نے ہم کو جن چیزوں کی ترغیب دی تھی یعنی نفع بخش علوم اور فائدہ رساں تربیت کا جو حکم دیا تھا اس سے روگردانی ہمارا شعار ہو گیا ہے، میں ان ساری کمزوریوں کا یہاں تذکرہ نہیں کرتا کیوں کہ یہ امور اگرچہ ہم جس کے درپے ہیں اس کے نامناسب نہیں ہیں لیکن طویل تشریح کا مقتضی ہے اور اس کے لیے یہاں اتنی گنجائش نہیں ہے مگر میں بطور اجمال کہتا ہوں کہ اسلام نیکی کا حکم کرتا ہے اور برائی سے روکتا ہے وہ اس امر پر رضامند ہی نہیں کہ ہم منافع یا مصالح سے ذرہ بھر غفلت برتیں، وہ ہم سے فتنہ و فساد کے ازالہ اور شر و منکر کے استیصال کی خواہش کرتا ہے اور ہمیں نیک اخلاق سے آراستہ ہونے کی ترغیب دیتا ہے، وہ ہمارے لیے بیان کرتا ہے کہ دین میں ہر نئی چیز کھلا کھلا گمراہی کا انجام دوزخ ہے نیز وہ علم پر بہت زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ طلب علم ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت پر واجب ہے نیز علم خواہ چین ہی میں کیوں نہ ہو حاصل کرنا چاہیے۔ وہ قائل ہے کہ کوئی علم نہ تو مضرت رساں ہے اور نہ کوئی جہل نفع بخش یہ ہیں اسلامی تعلیمات اور اسلامی اصول لیکن دور حاضر میں یا دین کے اندر ایسی چیزیں شامل کر دی گئی ہیں جو دین سے کچھ تعلق نہیں رکھتیں، انھوں نے دین کے حقیقی خط و خال کو مسخ کر دیا اور ایسی بہت سی من گھڑت چیزیں

اس میں داخل کر دی ہیں، کہ عقائد فاسدہ قواعد صحیحہ پر غالب آ گئے ہیں، لوگ بدعتوں کے گرویدہ ہو گئے اور فرائض و واجبات کو پس پشت ڈال دیا ہے قریب ہے کہ قرآن آلات طرب کے ساتھ پڑھا جائے اور نماز شراب خانوں میں ادا کی جائے، علم کا چراغ بجھ گیا، عزائم سست پڑ گئے اور ہمتیں پست ہو گئیں اپنی ضروریات کی قلیل مقدار حاصل کر کے ہم کم ہمت تو ہار کر بیٹھ گئے، تربیت کی شکل و صورت ہی بدل گئی، اخلاق بگڑ گئے، نفوس میں ہمت اور حوصلہ مندی کی جلا ہی باقی نہ رہی، کوششیں مختلف مقاصد جاکانہ اور نقاط نظر متضاد، منافع پراگندہ، مسلمانوں کا نظام درہم برہم اُن کے درمیان کئی تفرقہ انداز یاں دوسری قومیں، اُن کی دشمن، اُن کو پست اور ذلیل نظروں سے دیکھتی ہیں اور ایسی چیزیں اُن کی طرف منسوب کرتی ہیں جن سے دین اسلام منزّہ اور مبّرا ہے، لیکن لوگ اپنی طریقوں کے دلدادہ اور حد سے زیادہ اُن پر کاربند ہیں یہاں تک کہ ہمارے حالات دِگرگوں ہو گئے اور اس نتیجہ پر پہونچ گئے ہیں جیسا کہ صاحب المنار (رشید رضا مرحوم) کہتے ہیں:-

"عقیدہ جبر رکھنا توحید، علل و اسباب کا انکار ایمان اعمال مفیدہ کو چھوڑ دینا توکل، حقائق و اسرار کائنات کی دریافت و انکشاف کفر و الحاد، مخالفین مذہب کی ایذا رسانی دین، علوم وفنون سے جہالت برتنا اور خرافات و توہمات کے آگے سر تسلیم خم کرنا صلاح و فلاح، مجذوب کی طرح اور عقل کا فتور معرفت وعرفان، ذلت و خواری برداشت کرنا تواضع،

رسوائی پر راضی رہنا اور ظلم سہتے جانا تسلیم
و رضا ہے پستی، قدامت پسندی اور تقلید علم
و یقین ہے"

کون نہیں جانتا کہ یہ سب آفات و بلیات ہمارے اندر گھر کیے
ہوئے ہیں، یہی نہیں بلکہ ہماری حالت اس سے بھی زیادہ زبون ہوگئی ہے
ہم یہاں تک غنا اپنا قلم روک لیتے ہیں، اس قدر جو کہا گیا غیروں کی طرف سے
معذرت کے طور پر تھا جو اس طرح سمجھتے ہیں کہ ہماری زبون حالی ہمارے
دین کی وجہ سے ہے اور یہ کہ ہم پر جہالت و ضلالت کی جو گھٹائیں مسلط ہیں
وہ دین کا ایک جز ہیں جیسا کہ اس کتاب میں ان کے افکار و خیالات کو پیش
کرنے سے معلوم ہوتا ہے، حالانکہ دین ان تمام خرافات اور غلط فہمیوں سے
مبرا و منزہ ہے۔ ہم ایک اجنبی سے کس طرح یہ آرزو اور توقع رکھتے ہیں کہ وہ
اسلام کی نسبت حسن اعتقاد رکھے ہوئے ہے، حالانکہ وہ مسلمانوں سے
ایسے اعمال و حرکات سرزد ہوتے ہوئے دیکھتا ہے جو خلاف عقل ہیں اور
کسی شریعت میں اور کسی قانون کے نقطہ نگاہ سے صحیح نہیں ہیں، لیکن
غیروں نے جو کچھ ہمارے متعلق یا ہمارے دین کے باب میں سمجھا ہے
اور ہمارے اعمال کو ہمارے دین سے جو نسبت دی ہے اس میں وہ
ایک حد تک معذور ہیں کیوں کہ دین میں کونسی چیزیں داخل ہیں اور کونسی
اس سے تعلق نہیں رکھتی ہیں ان میں وہ فرق نہیں کرتے۔ ان کا عقیدہ
تو صرف یہ ہے کہ ہمارا عمل مامور بہ ہے نہ کہ منہی عنہ یعنی ہم جو اعمال اس وقت

بحیثیت مسلمان انجام دے رہے ہیں مخالفین کی نظروں میں دین اسلام سے تعلق ہیں، اسی نے یہ کام کرنے کا حکم دیا ہے؟ اگر اسلام منع کرتا تو ہم اس سے رک جاتے ؛

اب ہم قلم روک لیتے ہیں اور گفتگو کو مؤلف کے لیے چھوڑتے ہیں؛ اس کے ساتھ ساتھ ہم قارئین سے یہ خواہش کرتے ہیں کہ اس ترجمہ کے مطالعہ کے دوران میں ہمارے وہ اشارات بھی ذہن نشین کر لیں جن کو ہم پیش کر چکے ہیں ؛
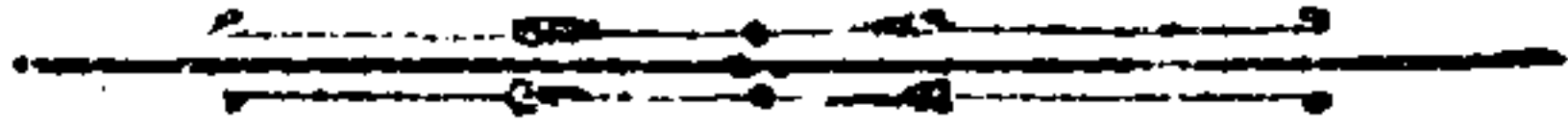
مقدمۂ مؤلف

ایک دن میں زرقوم اور تجیرے کے مابین ملک حوران کے صحرا میں گزر رہا تھا جس میں شریف مسلمان گھوڑوں پر سوار ہو کر میرے پیچھے آ رہے تھے۔ یہ الگ الگ دستوں میں منقسم تھے، اس لیے کہ ان کے باہمی اجتماع و تنظیم میں گھوڑے بدک جاتے تھے، جب کبھی کوئی پچھلا گھوڑا اگلے گھوڑے سے آملتا تو اگلا گھوڑا ہنہناتا اور پیچھے ہٹ کر سرپٹ دوڑنے لگتا اور کچھ دیر بعد یہ جوش و خروش ٹھنڈا پڑ جاتا، گھوڑے خراماں خراماں جا رہے تھے۔ ان کے درمیان ایک شخص ایک سفید بڑے گھوڑے پر سوار تھا، جس کو دیکھ کر گھوڑوں کی سکون آمیز رفتار تلاطم خیز بن جاتی تھی، اس گھوڑے پر جو شخص سوار تھا وہ ترنم ریز آواز میں کچھ اشعار پڑھ رہا تھا، جن کو سن کر سواروں کے دلوں میں جوش و نشاط کی لہریں دوڑ جاتی تھیں، اس کے اکثر اشعار راقم الحروف کی مدح سرائی میں تھے، میں اس گروہ کے درمیان ایک ایسا بادشاہ تھا، جس کے حاشیہ نشین اہل مشرق کے ان طریقوں کے مطابق جو تواضع اور کسر نفسی کے اظہار کے موقعوں پر استعمال کیے

جانتے ہیں، اس کی رضا مندی اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کرتے تھے، مسلسل چند گھنٹے اکتائے بغیر میں ان کے اشعار سنتا رہا، ان میں سے چند شعر میں نے یاد کر لیے۔ ان تمام میں ایک نظم اور قافیہ پایا جاتا تھا، لیکن ان کے معنی تشنۂ تفہیم تھے، مدح سرا اور ممدوح کے درمیان کوئی امتیاز نہ تھا، جیسا کہ ہم جیسے اہل مغرب کے لیے اس قسم کے اشعار کا مطلب سمجھنا دشوار ہے۔

میری عمر اس وقت پچیس سال کی تھی، سرما کا موسم دن نہایت خوشگوار، سہ پہر کی دھوپ، جسم میں نشاط اور قلب میں انبساط پیدا کر رہی تھی، آفتاب کی شعاعیں اپنے شباب پر تھیں، باد صبا کے جھونکے صحرا نوردوں کو بدمست بنا رہے تھے، ہوا کا ہر جھونکا زندگانی نو کا پیغام تھا اور ہر لہر موج صبا معلوم ہوتی تھی، اس کے باوجود میرے دل میں ایک احساس گذرا، یہ اشتیاق ایک ایسے ممدوح کے متعلق تھا جس کا نام ان بہادروں کے اشعار میں بار بار ذکر ہوتا تھا، اسی نشاط آفریں لمحات میں ہم راہ طے کر رہے تھے کہ شاعر یکایک خاموش ہو گیا اور میری طرف متوجہ ہو کر کرخت آواز میں کہا۔ جناب من! نماز عصر کا وقت آ گیا ہے، یہ سنتے ہی سوار گھوڑوں سے اتر پڑے نماز کے لیے صف آرا ہو گئے، نماز با جماعت مسلمانوں کے عقیدہ میں اللہ کے نزدیک افضل ہے، جیسا کہ عیسائیوں کا بھی یہی عقیدہ ہے، میں ان لوگوں سے دور کھڑا تھا، دل میں یہ آرزو کر رہا تھا کہ زمین اپنا سینہ شق کر دے اور مجھے نگل جائے، میں بھی چوڑی

پوشاکیں دیکھ رہا تھا جو نمازیوں کی نقل و حرکت کی وجہ سے پیچ و خم کھا رہی تھیں،
میں اُن کی زبان سے بار بار اللہ اکبر اللہ اکبر کی آواز سُن رہا تھا۔ یہ الٰہی نام
ذہن میں اِس طرح اثر کر رہا تھا کہ اس کے مقابلہ میں صوفیا کی ہائے وہو اور
متکلمین کی کتابوں کا درس و مطالعہ ہیچ تھا۔ میں اپنے اندر انفعالی جذبات
و تاثرات کا شدید احساس کر رہا تھا، جس کے اظہار کے لیے مجھے الفاظ نہیں
ملتے۔ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ سوار جو ایک لمحہ پیشتر میرے سامنے تواضع اور
فروتنی کا مظاہرہ کر رہے تھے، اب نماز کی حالت میں یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ
ان کا مقام و مرتبہ مجھ سے بالاتر ہے۔ اگر میں بھی حلقہ بگوش اسلام ہوتا تو ان
مقدس ہستیوں کے ساتھ مل کر یہ کہتا کہ میں بھی خدا پر اعتقاد رکھتا ہوں
اور جانتا ہوں کہ کس طرح عبادت کروں اور نماز پڑھوں۔ یہ جانتے اور بحالت
نماز ان کی تنظیم اور ان کا وہ لباس اور کس قدر نظر افروز منظر تھا۔ اُس نظر
ان کے گھوڑے سکون و اطمینان کے ساتھ ان کے پہلو میں کھڑے ہوئے
ہیں۔ گھوڑوں کی باگیں زمین پر پڑی ہوئی اور ان کے سر جھکے ہوئے ہیں،
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے لیے وہ بھی خشوع و خضوع میں مسجود ہیں۔ یہ
ایسے گھوڑے ہیں جن کو پیغمبر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس درجہ چاہتے تھے کہ
حسب ضرورت کے مطابق اپنی چادر کے حاشیے ان کے چہروں اور پیشانیوں
پر ملتے تھے۔

میں خود کو اس بیابان میں تنہا پاتا تھا۔ میں فوجی تنگ اور چست
وردی میں ملبوس جس میں میرا بدن جکڑا ہوا تھا، ایسی سرزمین میں جو ادیان

مذہب کا گہوارہ ہے بے ایمانی کے آثار مجھ سے ہویدا تھے، گویا میں اس جماعت کے روبرو جو خشوع و خضوع سے معمور دلوں اور صدق و ایمان کی تجلیات سے بھرپور سینوں کے ساتھ نماز پڑھ رہی تھی ٹھہرا کوئی کتا تھا، اس وقت توریت کی ایک آیت مجھے یاد آگئی کہ "خداوند سام کے شامیانہ میں رونق افروز ہوتا ہے اور یافث کی نسل میں زیادتی ہوتی ہے" یہ دونوں گروہ اس مقام پر مجتمع تھے، ایک یہ نمازی جو اولاد سام میں سے تھے اپنے پروردگار اور اپنے آباد و اجداد کے پروردگار کی عبادت و اطاعت سے خوشنود تھے، دوسرے وہ خداوند جو ابراہیم کے شامیانہ میں داخل ہوا تھا، میں یافث کی اولاد ہوں، جس نے جنگوں اور فتوحات میں شہرت اور ناموری حاصل کی۔

جب دشت پیمائی ختم ہوئی اور میں اپنی آرامگاہ میں پہونچ گیا تو میں نے اپنے افکار و خیالات کو جو میرے ذہن میں گذر چکے تھے قلمبند کرنا شروع کیا، میں نے اپنے اندر محسوس کیا کہ میں اسلام کی دلکشی اور شیرینی کا دلدادہ ہو گیا ہوں، گویا یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے بیابان میں ایک ایسی قوم کو دیکھا جو خالق موجودات کی عبادت کرتی ہے، میرے ذہن میں عیسائیوں کے خیموں کا وہ منظر کھنچ گیا جہاں عبادت گذار صرف عورتیں ہوتی ہیں، اس کے بعد میرے دل میں اہل مغرب کے کفر و الحاد اور قلت ایمان کی وجہ سے غیظ و غضب کے جذبات بھڑک اٹھے۔

میں عمر کی جس منزل میں قدم دھر چکا تھا عقل اس منزل میں مشکلات اور پیچیدہ مسائل کو حل کرنا آسان سمجھتی ہے، اس کی نگاہ اشیاء کے ظاہری رخ پر

پڑتی ہے اور سطحی طور پر نتیجہ اخذ کر لیتی ہے، تصور و خیال تنقید و جستجو اور بحث و کرید کی جگہ لے لیتا ہے اور انسان اس مرحلہ پر آزادانہ خیالات و اعتقادات پیدا کر لیتا ہے۔ یہ ایسا دور ہوتا ہے کہ اگر اس دور کے لوگ منصف مزاج اور اعتدال پسند ہوں تو اس عمر میں نہ کوئی چیز لکھتے ہیں اور نہ کوئی کتاب تالیف و تصنیف کرتے ہیں۔ میں جانتا تھا کہ دین اسلام کا جلال و جلال اس کی حقانیت و صداقت پر واضح شاہد ہے، اس لیے میں نے اس امر پر التفات کئے بغیر کہ قلم دل کی تابعداری میں کیا کچھ لکھتا ہے اسلام کے متعلق اپنے معتقدات و افکار کو قلمبند کرنا شروع کر دیا۔

اگر میں محض ظاہری امور کا تتبع کرتا اور بلا تحقیق و تدقیق اہم مسائل پر فیصلہ صادر کر دیتا تو میری کتاب نشانہ ملامت بنتی اور مستشرقین کے غیظ و غضب اور نفرت و حقارت کے تیروں سے اس کا سینہ چھلنی ہو جاتا جیسا کہ بعض مغربی مولفین اس کا خمیازہ بھگت چکے ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ موجودہ دور میں جو اشخاص اسلامی تحقیقات میں مشغول ہیں ان کی دو قسمیں ہیں، ایک گروہ مستشرقین کا ہے جو علماء کبار میں شمار ہوتے ہیں، دوسرا گروہ الجزائر کے مستعربین کا ہے، جو درحقیقت فرنگی ہیں، یہ گروہ الجزائر کے عربوں سے ربط و ضبط قائم کر چکا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلا گروہ دوسرے گروہ کی بہ نسبت زیادہ ترصحیح علمی خدمات انجام دے چکا ہے، اس لیے کہ ان کی علمی تحقیقات کے ذریعہ بہت سے ایسے اصول و مبادی ہاتھ آ گئے ہیں جن کی بدولت اس دور میں تاریخ اسلام

کا لکھنا سہل ہو گیا ہے، اس لیے کہ تاریخ اسلام کے بہت سے گوشے پردۂ خفا میں ہیں، مستعربین الجزائر کا درجہ اُن کے بعد کا ہے ان دونوں طبقوں کے درمیان اگر کوئی فرق کیا جا سکتا ہے تو وہ موجوداتِ عالم میں سلامتی نظر اور وسعت علمی کی زیادتی کے متعلق ہوگا، دوسرا گروہ مسلمانوں کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے، مسلمانوں کے باطنی افکار ادراک کرتا اور ان کی معیشت اور اُن کے دین کی حقیقت سے واقف ہے۔ اس قسم کی واقفیت کا حصول ایسے شخص کے لیے ناممکن ہے جو اُن ممالک سے باہر ہے، بنابریں وہ خود مستشرقین کی طرح اسلام کے متعلق خامہ فرسائی کرنے کا حق دار سمجھتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے فلسفہ و حکمت اور علم الکلام میں جس قدر کتابیں لکھی ہیں یہ گروہ ان سے واقف نہیں، لیکن میں اس عدم واقفیت کو کوئی بڑا نقص شمار نہیں کرتا، کیوں کہ موجودہ دور میں اسلام کی حقیقت سے آگہی کے لیے دینی علوم میں وسعتِ معلومات کی ضرورت نہیں ہے، علاوہ بریں ظہور اسلام کے آغاز میں جس قدر کتابیں تالیف کی گئی ہیں اُن کا مطالعہ کرنا بہ نسبت کسی اور کے ایک مورخ کے لیے واجبی و لازمی ہے، اس لیے کہ علم کلام اور اس کے مطالب و مباحث میں غور و خوض کرنے کا جذبہ بارھویں صدی سے کہنہ پڑ گیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کی بنیادیں محکم و استوار ہو گئیں۔ ان بحث کے مناقشے اور ناقدین کے منازعے اسلام پر اثر انداز نہیں ہو سکتے، جس طرح کہ اس قسم کے مباحثوں سے دوسرے ادیان و مذاہب کی بنیادیں اُکھڑ گئیں، بارھویں صدی کے بعد کے دور سے ہر مسلمان چاہے وہ عالم ہو

یا جاہل، امی طبقہ کا ہو یا ادنیٰ طبقہ کا، اس طرح ایمان و یقین کا حامل ہو گیا کہ اپنے یقین و ایمان کی تحصیل کے لیے عقل و دانش کی فرماں روائی کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا، بلکہ اس کے دل میں ایک ایمان ہے وجدانی، سادہ و قوی، راسخ و استوار، اس قسم کا محکم ایمان مسیحی قوموں میں بجز پست طبقات کے مشاہدہ میں نہیں آتا۔

جو اشخاص اسلامی تحقیقات میں دلچسپی اور شغف رکھتے ہیں ان پر اہل بحث نے منجملہ اور امور کے جس امر کو واجب گردانا ہے وہ علم اسماء الٰہی ہے یہ علم ایسا دقیق اور گہرا ہے کہ مستشرقین اس علم سے بخوبی واقف نہیں ہیں، جو فائدہ وہ اٹھانا چاہتے ہیں ان کو اس علم سے حاصل نہیں ہوا، جس وقت وہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ترجمہ جو قرآن کی ہر سورت کے آغاز میں ہے، پڑھتے ہیں تو ان کو بہت تعجب ہوتا ہے، اس لیے کہ اس ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مترجم یہ چاہتا ہے کہ جو لفظ یہاں وضع کیا گیا ہے اس کے اصل معنی تک پہونچ جائے، لیکن وہ اس امر کی طرف متوجہ نہیں ہوتا کہ اس تحقیق کی بدولت وہ بہت سے معانی جو اس لفظ سے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں نظر سے اوجھل ہو جائیں گے، یہ امر مسلم ہے کہ جس حقیقت کے ساتھ نام مفہوم ہو جاتا ہے اس کے مقابلہ میں جو فراوانی علم اور بکثرت مترادفات ظن و تخمین پر مبنی ہیں وہ ہرگز اس حقیقت کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتے، مستشرقین کہتے ہیں کہ رحمٰن ایک ایسا نام ہے جو مسیحی بت پرست مذہب میں خدا کے فرد مجسم کے لیے وضع کیا گیا ہے، اس معنی میں یہ لفظ ممکن ہے، لیکن جس وقت یہ

یہ حرف اسلامی لغت میں داخل ہوا ہے مسلمانوں کے نزدیک صرف اُس خدا کی صفات میں سے ایک صفت پر دلالت کرتا ہے، جس کی وہ عبادت کرتے ہیں، اور مسلمانوں میں کوئی ایسا ایک بھی پیدا نہیں ہوتا جو رحمٰن کو خدا کے اُن ناموں میں سے ایک نام جانے، جو اسلام سے بیشتر مشہور تھے؛ بنابریں میرا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ مستشرقین نے جن کے اقوال و بیانات کا میں احترام کرتا ہوں کوئی ایسے مطلب کی وضاحت کی ہو جو قرآن کی صداقت میں شبہ پیدا کرتا ہو، اور جس سے لازم آئے کہ شفقت و رحمت کے معانی کو لفظ رحمٰن سے جدا کیا جائے، کیوں کہ یہ معنی مسلمانوں کے اُن معہود تصوّرات کے ہم آہنگ ہے جن کو وہ ہر جگہ اور ہر زمانہ میں اس لفظ سے مراد لیتے ہیں۔

اِس کتاب کی نشر و اشاعت کے قبل میں نے ضروری سمجھا کہ اُن پہلوؤں کو اُجاگر کر دوں جن کی وجہ سے مجھے حق پہونچتا ہے کہ اسلام کے متعلق کوئی چیز لکھوں، میں نے طویل مدت سے عربوں کے ساتھ ربط و ضبط اور میل جول رکھا، مشرقیوں کی طبیعتوں کو پہچاننے میں زیادہ دلچسپی لی ہے، اسلامی معلومات بہم پہونچانے اور عربوں کے خط و خال کو آشکارا کرنے میں میں نے جو طریقہ و اسلوب اختیار کیا ہے وہ مستعربین الجزائر کا طریقہ ہے، اِس لحاظ سے میں مستشرقین سے معافی کا طالبگار ہوں، میری پہلی خواہش اُن سے یہ ہے کہ مجھے وہ اُن اشخاص کے پہلو بہ پہلو نہ قرار دیں جو عربوں کی طرف مائل ہیں اور اسلام کے بارے میں جو کچھ انھوں نے

اپنی مختصر سیر و سیاحت کے دوران میں مشاہدہ کیا ہے، قلمبند کر دیتے ہیں اور ان کے بیانات تخمین پر مبنی ہوتے ہیں یہاں تک کہ موسیو لوزون بھی اس لغزش سے محفوظ نہیں رہا، بلکہ اس کا پائے قلم غلط راہوں میں بھٹک گیا اور تخیلات میں جذب ہو کر رہ گیا، یہ شخص ان اشخاص میں سے ہے جو مشرق کی ہر چیز کو اچھی سمجھتے ہیں، اس کا عقیدہ اسلام کے بارے میں ایک افسانہ گو کا عقیدہ ہے نہ کہ محقق دانشمند کا عقیدہ، بنابریں اس کتاب سے میرا مقصد اسلام کی مدح سرائی اور اس کی بزرگی کا اظہار نہیں بلکہ جب میں نے دیکھا کہ موجودہ دور میں اسلام کا مسئلہ گراں قدر مسائل سے تعلق رکھتا ہے اور علماء و مفکرین کے ذہن و خیال کا مرکز بنا ہوا ہے، اسی مسئلہ کے گوشوں پر روشنی ڈالنے کے لیے پیرس میں ایک علمی مجلہ کی تاسیس عمل میں آئی ہے جو مسلمانوں کی ترقی کا رکا موجب ہو گیا ہے، حتیٰ کہ بعض عیسائیوں نے مسلمانوں کی مسجد کی تعمیر کے لیے جہاں وہ خدا کی عبادت کرتے ہیں مالی امداد بھی کی ہے، تو میں نے لوگوں کے رجحان کو غنیمت سمجھا اور اس سلسلہ میں مجھے موقعہ ملا کہ بعض ان غلطیوں کا ازالہ کر دوں جو پیغمبر اسلام اور دین اسلام کے متعلق ہم مسیحیوں کے افکار و خیالات میں راسخ ہو گئی ہیں، یہ کام انتہائی کٹھن اور صبر آزما ہے، کیوں کہ مسلّمہ ہے کہ کوئی چیز غلط اعتقاد سے بڑھ کر دیا گر نہیں ہوتی، نیز میرا عقیدہ یہ ہے کہ متمدن یافتہ مسیحی قوم کے لیے صرف اسیقدر کافی نہیں ہے کہ مسلمان رعایا کے دین کا احترام ملحوظ رکھیں بلکہ ان کا یہ فرض بھی ہے کہ اس دین کے حقیقی خط و خال کو پہچانیں ہم مسیحی تو مسلمانوں کے متعلق

مسلمانوں کے کینہ و بغض اور اُن کی دشمنی و نفرت کی داستانوں کو سن کر ہنستے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ جاہل اور متعصب قوم ہے اور غلط طور پر ہم سے دشمنی رکھتی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ عیسائی بھی مسلمانوں کی نسبت اسی قسم کا بغض و کینہ رکھتے ہیں، اور ان کی روش عادلانہ نہیں ہے، دین اسلام کے متعلق جو چیز ہمارے نزدیک تمام اوہام و خرافات سے بڑھ کر رسوخ رکھتی ہے وہ ایسے عقائد ہیں جو پیغمبر اسلام کی شخصیت کے باب میں ہم رکھتے ہیں، اس لیے میں نے چاہا کہ سب سے پہلے پیغمبر علیہ السلام کی شخصیت کی تحقیق اور آپ کے صفات و خلاق پر بحث کروں اور اس بحث میں آپ کی امانت و صداقت پر جو جملہ مورخین مذاہب اور جلیل القدر پیروان مسیحیت کے نزدیک متفقہ شئے ہے، نئی دلیل قائم کردوں۔"
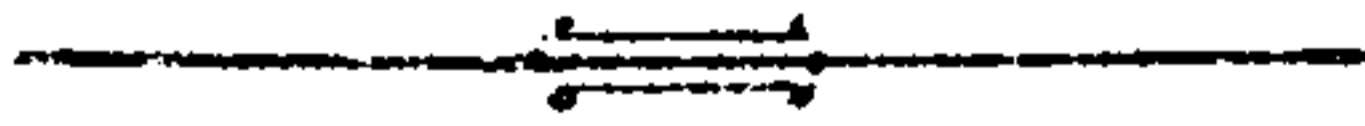
باب اوّل

پیکرِ صداقت

آنحضرتؐ کے متعلق مسیحی شعراء کی ہرزہ سرائیاں۔

میں ایک طالب علم سے جو کلستان میں میرے ساتھ تھا، ہر چند ادیان و مذاہب کے باب میں مباحثہ کرتا تھا، لیکن وہ مباحثے سے پیچھا چھڑانے کی خاطر مجھے جواب دیتا تھا کہ مسیحی کہتے ہیں کہ "خدا کے لڑکا ہے اور محمدؐ ساحر ہیں" وہ اس جملہ کو اس قدر حقارت آمیز لہجہ میں ادا کرتا تھا جیسے کوئی معتقد شخص بت پرست کو جواب دے رہا ہے؛ باوجودیکہ وہ میرا حد درجہ احترام کرتا تھا اور میرے اور اس کے مابین خوشگوار روابط تھے؛ لیکن اس کا اعتقاد یہ تھا کہ آنحضرتؐ کے سحر کے عقیدہ

کی مانند عقیدۂ تثلیث خرافات میں سے ہے، اور عیسائی جنہوں نے یہ دو مفروضے گھڑ لیئے ہیں نہ مجبت کے قابل ہیں اور نہ مباحثہ کے سزاوار مجھے نہیں معلوم کہ مسلمان اگر قرون وسطیٰ کی داستانوں اور مسیحی شعراء کی ہرزہ سرا گیتوں کو پڑھ لیں تو کیا کہیں گے، ہمارے تمام گیت یہاں تک کہ وہ ترانے جو بارہویں صدی سے پیشتر ظہور پذیر ہو چکے ہیں ایک ہی فکری سطح پر قائم ہیں، اور ایک ہی مقصد و مدعا یعنی صلیبی جنگوں کی آگ بھڑکانے کے لیے کار فرما ہیں، اُن کے یہ تمام اشعار مسلمانوں سے بغض و کینہ اور نفرت و دشمنی سے معمور ہیں، اس کی وجہ مسلمانوں کے دین سے بالکلیہ جہالت و ناآشنائی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے، ان قصائد اور گیتوں کا نتیجہ لوگوں کے ذہنوں میں دین اسلام کی متضاد داستانوں کا برقرار ہو جانا اور غلط فہمیوں کا جاگزیں ہو جاتا ہے، آج تک بھی ایسی ہی بعض غلط باتیں دلوں میں رچ گئی ہیں، جس کسی نے بھی کوئی گیت یا قصیدہ لکھا ہے اس میں مسلمانوں کو مشرک، بت پرست، بے ایمان اور خارج از دین قرار دیا ہے، مسیحی شعراء مسلمانوں کے لیے تین خدا کے قائل ہیں جو علی الترتیب اس طرح ہیں، پہلا ماہوم جس کو ماھوم، یا فیدا ور ماھومنہ کہتے ہیں یہ محمدؐ ہے، اس کے بعد دوسرا البین، اور تیسرا ترفاجان ہے، اُن کا دعویٰ ہے کہ محمدؐ نے اپنے دین کو الوہیت کے ادعا سے وضع کیا ہے، یہ ایک عجیب و غریب امر ہے کہ محمدؐ پر جو بتوں کے دشمن اور بت شکن ہیں مسیحی شعراء یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ آپ نے ایک زریں پیکر بت اپنے لیے تراشا اور لوگوں کو اپنی

پرستش کی دعوت دی ہے، جیسا کہ کوتنجیان کا عقیدہ ہے اور وہ اس بات کے قائل ہیں کہ جس وقت فرنگیوں نے مسلمانوں پر قبضہ کرلیا اور ان کو قسطنطنیہ کے حصار تک بھگا دیا تو مسلمان بتوں کے پاس گئے اور ان کو توڑ دیا، چنانچہ اس دور کا ایک مورخ بیان کرتا ہے کہ

"ایلین مسلمانوں کا خدا ایک غار میں تھا، مسلمانوں نے شکست کھانے کے بعد اس پر سنگ باری کی اور فحش اور مغلظ گالیاں دیں اس کے ہاتھ کاٹ دیئے، ٹھوکروں اور لکڑیوں سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، لیکن ماہوم کو ایک گڑھے میں ڈال دیا اور کتوں اور سوروں کو اس راستہ پر چھوڑ دیا تاکہ اس کو پارہ پارہ کر دیں، اس قسم کی ذلت و رسوائی آج تک کسی خدا کو نہیں پہونچی، معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اس عمل سے پشیمان ہوئے اور جو تباہی و بربادی بتوں پر ڈھائی تھی اس میں اصلاح کی، اس لحاظ سے شہنشاہ کاروس جب قسطنطنیہ میں داخل ہوا تو اس کے حکم سے حکومت کے لوگوں نے شہر کے اطراف گشت لگائی مسجدوں اور بازاروں میں داخل ہو کر ہتھوڑوں کے ذریعہ جو ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے تھے ماھومیدا اور تمام بتوں کو

توڑ دیا۔"

ریشار نے بھی اپنے گیتوں میں اسی قسم کے اشارے کیئے ہیں، ریشار کے ترانے اچھے ہیں، اُن کے اندر خرافات تو نہیں لیکن وہ کذب و دروغ اور تہمت والزام سے لبریز ہیں، کیوں کہ اُس نے خدا سے یہ درخواست کی ہے کہ اِس جماعت کو جو ہیکل ماھوم کی پرستش کرتی ہے کمزور کر دے، اس وقت وہ قوم کے سرداروں کو مقدس جنگ کی ترغیب و تحریص دِلاتا ہے اور نصیحت کرتا ہے کہ مسلمانوں کے بتوں کو سرنگوں کر دیں۔

"اُٹھو اور ماھومیدا اور ترفاجان کے بُت کو
سرنگوں کر دو، اُن کو آگ میں جھونک دو، اور
اِس طرح تم اپنے پروردگار کا تقرب حاصل کرو۔"

اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ ہیکل ماھوم بہترین پتھروں اور دھاتوں سے نہایت اِستحکام و پائداری کے ساتھ تراشا گیا ہے، جو شخص بھی قصائد رولان میں ہیکل ماھوم کی جو توصیف کی گئی ہے اُس کو دیکھے تو قسم کھا کر کہے گا کہ یہ شاعر جو کچھ بیان کرتا ہے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کی ہوئی چیز ہے، چنانچہ وہ اپنے قصیدہ میں کہتا ہے۔

"ماھوم کی ساری تصویر سونے اور چاندی سے بنی
ہوئی ہے، اگر تم اُس کو دیکھ لو تو یقین کر لو گے کہ اِس
سے بہتر نقاشی اور تصویر کشی عقل کے لئے ناممکن ہے،
اُس کی شکل بڑی اور اُس کی ساخت بہت اچھی

بزرگی کے آثار اس کے چہرے پر ہویدا، یا ہو م سونے اور چاندی سے بنا ہوا ہے، اس کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے، اس کو ایک ہاتھی کے اوپر بٹھایا گیا ہے جو ایک شاہکار صنعت میں سے ہے، اس کا شکم خالی ہے، اس کے درمیان ایک روشنی دکھائی دیتی ہے، گراں بہا اور درخشاں ہیروں سے آراستہ ہے، اس کا اندرون اس کے بیرون پر روشن ہے اس صناعی کی کوئی مثال و نظیر نہیں، خدا مصیبت کے موقعوں پر وحی نازل کرتے تھے، مسلمان جب کسی ایک جنگ میں شکست کھا گئے تو ان کے سردار نے ایک شخص کو خدا کی تلاش میں مکہ کو روانہ کیا، جن لوگوں نے یہ واقعہ دیکھا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ خدا یعنی محمدؐ ایک لشکر جرار کے ساتھ طبل و ساز کی بلند آوازوں میں نمودار ہوا، کچھ لوگ گا رہے تھے، کچھ لوگ رقص کرتے تھے اور بلند آواز سے کچھ اشعار پڑھتے تھے، اس کو ایک ایسی مجلس میں لے آئے جہاں محفل آراستہ کی گئی تھی اور خلیفۂ اسلام اس کے انتظار میں تھا، جب خلیفہ نے اس خدا کو دیکھا تو

اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور خشوع و خضوع کے ساتھ
عبادت میں مشغول ہو گیا۔"

ریشار اس بے بنیاد اور من گھڑت واقعہ کو نقل کرنے کے بعد اُن بُت پرستوں کی اس بُت کے ساتھ دعا و مناجات کی کیفیت کو بیان کرتا ہے جس کا وصف اُوپر ذکر کیا ہے کہ اس کا شکم جو فدا رہے جو کچھ اس کے اندر ہے بیرون آشکار ہے، اس کے بعد کہتا ہے:-

"جادوگروں نے ایک دیو کو پکڑ کر اس بت کے
شکم میں چھوڑ دیا ہے، اور وہ دیو گرجتا اور شور
کرتا ہے، اور اس کے بعد مسلمانوں سے میل
جول شروع کرتا ہے اور وہ اس کی باتیں کان
دھر کر سنتے ہیں۔"

بعض عیسائیوں نے اِس بُت کے بارے میں چند قدم آگے بڑھ کر اس کو دینِ اسلام کا نشان قرار دے دیا ہے، جیسا کہ صلیب کو دینِ مسیحیت کا شعار گردانتے ہیں، بالڈوین نے جو قصیدہ کنٹس بونیٹو کے بارے میں لکھا ہے اُس میں وہ کہتا ہے کہ جس وقت صلاح الدین کے سامنے بونیٹو نے مسلمان ہونا چاہا تو صلاح الدین سے کہا "میں محمدؐ کی عبادت کرنا چاہتی ہوں اس کو میرے سامنے لاؤ، جب وہ پیکر لایا گیا تو بونیٹو زمین پر گر پڑی اور سجدہ کیا" دوسرے قصیدہ سے جو بظاہر بالڈوین کے قصائد کی تکمیل کے لیے گھڑا گیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کیلئے

علاوہ اُن خداؤں کے جن کا ذکر ہوا دو اور خدا ہیں ایک "بارتوان" اور دوسرا "جوبین" لیکن اوّل الذکر تین خداؤں ہی کو اقتدار حاصل ہے، جس وقت ایک مسیحی سردار نے مسلمانوں کے لشکر کو جو مکہ سے آیا ہوا تھا لوٹا دیا تو شاعر اس موقعہ پر مسلمانوں کے اضطراب کا خاکہ اس طرح کھینچتا ہے:۔

"بُت پرستوں نے فریاد و زاری شروع کر دی
سراسیمہ و پریشان تھے اور بلند آواز سے کہتے تھے
اے ترفاجان! اے ماھوم!!"

ان قصیدوں کے باوجود ایک اور قصیدہ قرونِ وسطیٰ میں نمایاں ہوتا ہے جس میں محمد کی طرف بُت کے عنوان کا اشارہ نہیں ملتا، یہ قصیدہ پادری اسکندر و ڈیون کا ہے جو اُس نے ۱۲۵۸ء میں لکھا، اور اس قصیدہ کے مطالب کو ایک مسلمان کی زبانی جو عیسائی مذہب میں داخل ہو چکا تھا اخذ کیا ہے لوگوں کو یہ خیال ہو گیا کہ پیغمبرِ اسلام کے متعلق یہ صحیح تاریخی قصہ ہے، اس قصیدہ میں وہ لکھتا ہے:۔

"معلوم ہے کہ محمد مکر و فریب اور خیانت کے
طریقوں سے واقف تھے"

آگے چل کر قصیدہ گو پیغمبرِ اسلام کو امرا میں سے ایک امیر سے تشبیہ دیتا ہے جس کے پیروؤں نے اُن کو اُچھالا، یہ اپنے دین کو انتہائی وسعت اور سادگی کے ساتھ پھیلاتے تھے، اُن کے متعلق لوگوں کا جو اعتقاد تھا وہ پاپائے روم کی نسبت اعتقاد سے بہت بڑھا ہوا تھا؛

ہم نے اُن گمراہ کن تصوّرات کو تفصیل سے اِس لیے بیان کیا ہے کہ اسکندر رنڈکور کی تاریخ نے اُن غلط عقائد کا اِزالہ نہیں کیا، نیز اُن خرافات اور مَن گھڑت اَفسانوں کا اثر آج تک مسیحی اقوام کے ذہنوں میں مرتسم ہے اور اُن کے افکار وعقائد پیغمبر اسلام اور قرآنِ پاک کے بارے میں اُن تاریک خیالات سے لبریز ہیں، اگر کوئی شخص ہم سے یہ سوال کرے کہ کیا جن اشخاص نے یہ قصائد کہے ہیں وہ اپنے اقوال وافکار کے صحیح ہونے کے قائل تھے، یا نہیں؟ ہم اہلِ نورمنڈ کے طریقہ پر اس کا جواب نفی واثبات میں دیتے ہیں، اِس لیے کہ عیسائی جس قسم کا میل جول مسلمانوں کے ساتھ رکھتے تھے اُس کی بدولت دینِ اِسلام اور پیغمبر اسلام کی شخصیت کو سمجھنا اُن کے لیے آسان تھا، لیکن اُنھوں نے اپنے قصائد میں جو بیہودہ باتیں پیش کی ہیں اُن سے اُن کا مقصود تاریخی حقایق و واقعات کو بیان کرنا نہ تھا بلکہ اصل منشا یہ تھی کہ اِسلام اور مسلمانوں کی طرف سے اپنی قوم کے سینوں میں عداوت ودشمنی کی روح کو بیدار کردیا جائے، اس کے لیے ضرورت اِس امر کی تھی کہ مسلمانوں اور پیغمبر اسلام کی نسبت ایسے اوصاف وکردار ذکر کیے جائیں جو عیسائی قوموں کے نفوس میں اُن کے میلانات ومعلومات کے مطابق اثر کرجائیں جب ہم قرون وسطیٰ کے شعراء سے گذر کر اُن کے بعد کے اُن مؤرخین ومتکلمین کی طرف رجوع کرتے ہیں جن کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس زمانے میں اعتدال کی طرف مائل ہیں تو ہم ان کی تصانیف وتالیفات کو اُن ہی مَن گھڑت اَفسانوں اور عقائد باطلہ سے لبریز پاتے ہیں جو

پیغمبر اسلام کی شان میں طعن و تشنیع کا گہرا رنگ لیئے ہوئے ہیں، عیسائی متکلمین کا گروہ جو دین مسیحیت کی اصلاح کے لیے اٹھا تھا اور خود کو پروٹسٹنٹ سے موسوم کرتا تھا آنحضرت کی مخالفت پر اوروں سے زیادہ کمربستہ تھا، جلیاندر نے آنحضرت کو شیطان سے تشبیہ دینے پر بہت زور صرف کیا ہے اور قرآن پاک کو اور جو اشخاص کہ کتاب اللہ اور شریعت اسلامیہ پر عمل کرتے تھے اُن کو اسی کردار سے نوازا ہے، ہم اپنے اس قول پر کوئی برہان نہیں پیش کرتے بلکہ قارئین کی توجہ کو ریلان کی کتاب کے مقدمہ کا مطالعہ کرنے کی طرف مبذول کراتے ہیں، یہ کتاب ریلان نے ۱۷۲۱ء میں اس عنوان کے تحت تالیف کی کہ "کیا سبب ہے کہ عامۃ الناس دین محمدی سے صرف سرسری طور پر واقف ہیں"؟ مقدمۂ کتاب میں اس طرح رقمطراز ہے:-

"اگر اہل تحقیق کسی مذہب یا مسلک کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ لگانا چاہتے ہیں تو اس کو محمد کی طرف منسوب کر دیتے اور اس طرح کہتے ہیں کہ مذہب محمدی یا طریقہ محمدیہ وعلی ہذا القیاس"

اسی طرح پوپ ڈان مارتینو الفونسو تیکا لدو نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "چراغ زرین کلیسائے مقدس" اس میں وہ لکھتا ہے کہ

"محمد نے جو کتاب پیش کی ہے اس کو نہیں پڑھنا چاہیئے، بلکہ اس کا مضحکہ اڑانا اور اس کی توہین و تذلیل کرنا واجب ہے، جہاں کہیں بھی وہ

نظر آجائے اُسے آگ میں جھونک دیں، لوگوں
کے یہ شایانِ شان نہیں کہ اِس کتاب کی حفاظت
کریں کیوں کہ یہ کام جانوروں کا ہے۔"

بعض لوگ تو اِس کتاب کو نذرِ آتش کر دینا ضروری نہیں سمجھتے بلکہ یہ
کہتے ہیں کہ:۔

"یہ دردِ سری نہیں تو اور کیا ہے کہ اِنسان اپنے کو
ایسے مضحکہ خیز مطالب اور ہرزہ سرا امور کے یاد
کرنے کی زحمت میں مبتلا کرتا ہے جو ایک ایسے
اِنسان کی پیداوار ہیں جو حواس باختہ اور مضطرب
القویٰ تھا۔"

اِن کتابوں میں مسلمانوں کو نادان، کاہل، خچر، اور جنگلی گدھے جیسے
ناگوار ناموں سے یاد کیا گیا ہے اور اُن کو کینہ پروروں سے نامزد کیا ہے
جو راتیں عورتوں سے گھر کو زینت بخشتے ہیں اور دن میں ان کو طلاق
دے ڈالتے ہیں، اگر آپ اُن کے مخلفات کی زنبیل کی پہنائیوں اور
اُن کے تیر ہائے دُشنام کے ترکش کی گہرائیوں کو معلوم کرنا چاہتے ہو تو
پردشار نام ایک مسیحی کی کتاب کا مطالعہ کیجئے جس کو اس نے "راہنمائے
سیاحت" سے نامزد کر کے ۱۳۳۲ء میں فیلپ روتالو کی خدمت میں
پیش کیا ہے، اس میں وہ اُن اسباب و دواعی پر روشنی ڈالتا ہے جو اُس
کے لیے صلیبی جنگوں کی دعوت کا موجب ہوئے ہیں، چنانچہ وہ کہتا ہے:۔

"کونسی آنکھ ہے جو یہ جان لینے کے بعد کہ آج
ہمارے ملکوں اور ہمارے مقدس مقامات پر کیسے
لوگ قابض ہوگئے ہیں، سیل اشک نہ بہا رہے،
یہ ایسے افراد ہیں کہ نہ ان کا کوئی خدا ہے اور نہ کوئی
دین، جو ان کی ہدایت کا سبب بنے، وہ ایسی شریعت
کے حامل بھی نہیں ہیں جس پر وہ عمل درآمد کریں، نہ
وہ کسی عہد و پیمان پر قائم ہیں نہ ان کے اندر شفقت
و رحم کی بو باس ہے، یہ پست، ذلیل قوم ہیں اور
ہر روشن حقیقت ہر نیکی و خوبی اور عدل و انصاف
کے دشمن ہیں، صلیب کے مخالف، خدا کے منکر
اور عیسائی قوموں کے لیے ظالم ہیں، بکثرت
عورتیں رکھتے اور ان پر زیادتی کرتے ہیں، بچوں
پر جبر و قہر کی بجلیاں گراتے، جانوروں پر ظلم و ستم کے
کوڑے برساتے ہیں، انسانی طبائع سے ان کو
بیر ہے، خوبیوں اور نیکیوں کو برباد اور اخلاق کو
تباہ کرتے ہیں، منکرات و جرائم کے بحر ظلمات میں
غرق ہیں، شیطان کے دوست، کمینوں کے
ساتھی بغض و حسد کے عناصر کے حامل، کوتاہ خیال
بدکردار، نادار، فحش گو، بدتمیز، ان کے احساسات

اور از راوحے نفسانی خواہشات اور بہیمانہ لذائذ میں
سرشار، یہ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے ہم کو ہمارے
ملکوں سے دُور اور خانماں برباد کر دیا، یہاں بھی
ہم جس چھوٹے سے قصبہ میں ہیں ہم پر ظلم و ستم ڈھایا
ہمارا مذاق اڑایا، ہمارے دین کو مضحکہ خیزیوں کا
نشانہ بنایا، یہی ہیں وہ لوگ جنھوں نے خانۂ خدا کو
تباہ کیا، شہر مقدس کے جو ہماری شریعت کا محیط ہے
مالک بن بیٹھے اور مقدس مقامات کو اپنے ناپاک
قدموں سے آلودہ کر دیا۔

آنحضرتؐ اور تاریخ یہی رُوح اور یہی افکار ہمیشہ مسیحی مصنفین و مؤلفین پر مسلط رہے ہیں حتیٰ کہ انگلستانی مستشرق بریدو نے ۱۷۲۳ء میں ایک کتاب سیرت آنحضرت میں لکھی اور اس کا نام "حیات پیغمبر محمدؐ کی زندگی" رکھا، بعضوں نے اس کتاب کا ہماری (فرانسیسی) زبان میں ترجمہ کیا اور شروع میں ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں وہ مصنف کے اصل مقصد و مدعا کو بیان کرنے کے بعد کہتا ہے:۔

"اس کتاب سے مؤلف کی غرض و غایت اس
مرد شریر محمدؐ کی زندگی کو ذکر کر کے حکیم مسیحی کے مقصد
کی خدمت انجام دینا ہے۔"

ان مصنفین کا مقصد تاریخ نگاری نہیں بلکہ جیسا کہ وہ خود قائل ہیں حکیم مسیحی

کے مقصد کی خدمت کرنا ہے، وہ اپنے کمزور دلائل کی تائید میں جو واحد ہتھیار پیش کرتے ہیں یہ ہے کہ حتی الوسع اپنے فریق مخالف پر گالیوں کی بوچھاڑ کریں اور حتی المقدور روایات کے نقل میں تحریف کریں، ڈاماسین نے چونکہ دمشق میں تربیت پائی اور خلفاء کے نزدیک مقرب تھا اس لیے اس نے کوشش کی ہے کہ دیگر مؤلفین کے خلاف دین اسلام کی بدون تعصب مدافعت کرے، بنابریں اس نے عیسائیوں کے بے سروپا افسانوں کو دین مسیح میں ایک جدت شمار کیا ہے جو آریوس کی جدت کے مشابہ ہے، اس کے باوجود اس کی اس تعبیر نے اہل یورپ کے عقیدہ پر کچھ اثر نہ کیا، بلکہ پیغمبر اسلام اور قرآن پاک کے بارے میں ان کے خرافات سے لبریز جو عقائد تھے وہ علیٰ حالہا باقی رہے، ارباب کلیسا اور روسا روحانی ہمیشہ اس عقیدہ کی تائید میں اور اس کو ذہنوں میں جاگزیں کرنے میں جدوجہد کرتے تھے، اسی سیاست کا نتیجہ ہے کہ ہماری قوم دین اسلام کا مذاق اڑانے لگی اور یورپ کو اسلام کے ساتھ صحیح جنگ و جدل کرنے سے بے نیاز کر دیا، کیوں کہ کلیسائے لاطینی آٹھویں صدی میں دوسرے کاموں میں مشغول تھی، اس کا سبب یہ تھا کہ مشرقی کلیسا دو مضرت رساں عناصر یعنی دو مختلف العقائد پارٹیوں میں گھری ہوئی تھی، ایک گروہ دو جسدوں میں ایک روح کا قائل تھا اور دوسرا گروہ ایک ہی جسد میں ایک روح کا دعویدار تھا، اسلام کے متعلق بحث و تحقیق کی روح تعصب و تقلید کے شائبوں سے پاک ہو کر ابھی شروع نہ ہوئی تھی، اس کا آغاز تو صرف ہمارے دور کا رہین منت ہے، چنانچہ انیسویں صدی میں ارباب بحث و تحقیق نے اس مسئلہ کو بصیرت افروز ناقدانہ نگاہ سے دیکھنا شروع کیا، اس کا

نتیجہ ہوا کہ لوگ قرآن کے باب میں مختلف ہو گئے بعضوں نے تو اس کے کمال خوبی کا اعتراف کیا اور بعضوں نے اس کو مورد طعن و مذمت ٹھہرایا، باوجودیکہ اس صدی کے ارباب بحث کی بنیاد دقت نظر اور عدم تقلید پر ہے لیکن موخر الذکر گروہ کی زبان سے جو قرآن میں جرح و قدح کرتے ہیں ایسے کلمات و عبارات دیکھے جاتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ گذشتہ افکار و عقائد ان میں اثر انداز ہو چکے ہیں، موسیو در ونشے... اپنے بلاد عرب کے سیاحت نامہ میں جس کو ۱۸۷۵ء میں شائع کیا ہے پیغمبر کی نسبت کہتا ہے۔

"وہ ایک پست طبع خائن عرب تھے"

لیکن اس نے یہ فراموش کر دیا کہ یہ الفاظ جو سننے والے کے لیے ناگوار خاطر ہیں آج دعویٰ کی صحت پر دلیل بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں۔

بنیادی عقیدہ

پہلا مسئلہ جو مورد بحث و نظر ہے وہ پیغمبر اسلام کے صدق رسالت کا مسئلہ ہے، ہم کہہ چکے ہیں کہ پیغمبر اسلام کی راستبازی تقریباً تمام مستشرقین و متکلمین کے مابین مسلّم ہے، ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ قرآن کے آسمانی کتاب ہونے کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، ہم کو آنحضرتؐ کی صداقت کے اثبات میں صرف اسی قدر پیش کرنے کی ضرورت ہے کہ آپ اپنی رسالت کی صداقت اور اپنی نبوت کی حقیقت کے معتقد تھے اس رسالت کی اصلی غرض و غایت آپ کے نزدیک یہ تھی کہ بتوں کی پرستش کی جگہ جس پر پیغمبر کے ظہور کے وقت آپ کی قوم کاربند تھی، خدائے واحد کی عبادت کو رائج کیا جائے، اس مفہوم کی توضیح یہ ہے کہ جس وقت حضرت اسمٰعیل علیہ

کی ولادت پر حضرت سارہؑ کو حسد پیدا ہو گیا اور آپ اپنے باپ کے خاندان سے نکال دیئے گئے تو بلادِ عرب کی طرف روانہ ہوئے، اور اپنے ساتھ یہاں اپنے باپ حضرت ابراہیمؑ کا دین بھی رائج کر دیا، لیکن اس دین کی چند پرچھائیاں عربوں کے درمیان باقی رہیں، کیونکہ نبی اسمٰعیل کی طرح عربوں میں کوئی ایسا شخص نہیں رہا جو ہمیشہ اُن کو اس کی یاد دلاتا رہتا، کہ ابراہیم کا خدا ہی وہ غالب پروردگار ہے جو اپنے کبریائی میں کسی اور کو شریک کرنے کا روادار نہیں، یہ اعتقاد رفتہ رفتہ زائل ہوتا گیا اور اس کی جگہ اُن مختلف دیوتاؤں اور خداؤں کی پرستش ہونے لگی جو دوسری قوموں میں مشہور و معروف تھے یہاں تک کہ حضرت اسمٰعیل کا دین بالکلیہ فراموش کر دیا گیا، پھر بلادِ شام کے آس پاس کے بعض قبیلوں میں یہودیت رچ گئی، لیکن مسیحیت اُن اکناف و اطراف میں اُس وقت ظہور پذیر نہ ہوئی تھی، یہاں تک کہ بصرہ کے پوپ (تیث) نے چوتھی صدی میں اعتراف کر لیا کہ خانہ بدوش عربوں کی زندگی اس دین کے جزیرۂ عرب میں پھیلنے سے مانع ہے۔

ساتویں صدی عیسوی تک بلادِ عرب میں مذہب کا یہی حال تھا، مؤرخین و مؤلفین نے اس باب میں اپنے اپنے میلان و عقیدہ کے مطابق بحث کی ہے، بنا بریں جزیرۃ العرب کے باشندوں کے حالات اور اُن کے مذہب کے متعلق اُن کے اقوال باہم متناقض و مختلف ہو گئے ہیں، موسیو روذان کہتا ہے، کہ تاریخ تمدن میں قبلِ اسلام بلادِ عرب کی حالت کے مقابلہ میں کوئی بہتر صورت دکھائی نہیں دیتی، موصوف کے عقیدہ میں یہاں کے قبائل

یہودیت یا مسیحیت کے پابند تھے اور ایک بڑے دین کی تحریک میں دلچسپی لیتے تھے، موسیو بارتیلے سانٹ ھیلیو کہتا ہے کہ اگر یہ صحیح ہوتا کہ عرب کی قومیں تمدن کے ایک بلند مقام پر تھیں جیسا کہ بعضوں کا دعویٰ ہے، تو ان کو اس قسم کی اخلاقی تعلیمات کی ضرورت نہ پڑتی کہ جن کے سننے سے ہمارے جسم کانپنے لگتے ہیں۔

حرمت علیکم امھاتکم وبناتکم واخواتکم وعماتکم وخالاتکم وبنات الاخ وبنات الاخت الایۃ	تم پر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری پھوپھیاں، تمہاری خالائیں بھتیجیاں اور بھانجیاں۔

(النساء)

"اس مؤلف کے عقیدہ کے مطابق قوم عرب وحشت و بربریت میں اس دور کے عبرانیوں کی حالت سے قریب تر تھی جب کہ حضرت موسیٰ ان کے درمیان مبعوث ہوئے تھے اور ان پر اس قسم کے امور حرام قرار دیئے"

میں نہیں چاہتا کہ ان دونوں قول میں سے کسی ایک قول کو ترجیح دینے کی بحث میں پڑ جاؤں لیکن میرے خیال سے ان دونوں قوموں کے درمیان "اوسط قرین صواب ہے"، وہ یہ ہے کہ قوم عرب پیغمبر اسلام کے بیشتر عموماً بت پرست تھی، ان کے ذہنوں میں کبھی کبھی توحید کی بجلی کوندجایا کرتی تھی، جو لوگ اس قسم کا عقیدہ رکھتے تھے وہ ایک ایسے گروہ سے تعلق

رکھتے تھے جن کو حنفاء سے نامزد کیا جاتا تھا اور یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مذہب پر باقی تھے، مسیحیوں کے بہت سے فرقے پائے جاتے تھے وہ تمام مذہب تکثیر (تعدد آلہہ) کا عقیدہ رکھتے تھے، آنحضرتؐ نے مذہب حنفاء کو سطحی طور سے سیکھا، لیکن چونکہ فطری طور پر آپ کی روح دین کی متمنی تھی اس لیے یہ مذہب آپ کے وجدان میں نشو ونما پایا اور اعتقاد کی اُس حد تک پہونچ گیا کہ آپ سے قبل سوائے معدودے چند کے کسی کو بھی حاصل نہ ہوا تھا، یہ وہی عقیدہ محکم ہے جس نے بنی نوع انسان میں بالکلیہ انقلاب رونما کیا، اگر ہم اس مبدا فیض عام کو حنفاء کے علاوہ کسی اور طریقہ میں تلاش کرنا چاہیں تو غلطی پر ہوں گے اس لیے کہ آنحضرتؐ نوشت وخواند سے واقف نہ تھے، بلکہ آپ پیغمبر اُمّی تھے جیسا کہ بار بار آپ نے اسی قسم کا اپنا تعارف کرایا ہے، آپ کا یہ وہ وصف ہے کہ آپ کے کسی معاصر نے بھی اس سے اختلاف نہ کیا، بلا شک وشبہ یہ امر محال وناممکن ہے کہ کوئی شخص مشرق میں اس طرح تحصیل علم کرے کہ لوگ اس سے آگاہ نہ ہوں، اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرقیوں کی زندگی کے تمام گوشے اور شعبے برملا اور آشکار ہیں، علاوہ بریں نوشت وخواند اور تعلیم وتربیت کے وسائل وطرق اس زمانے میں ناپید تھے، کہیں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو لکھ پڑھ سکتا ہو، لیکن جارسین دی تاسی نے اپنی کتاب میں جو ۱۸۴۶ء میں طبع ہوئی ہے ایک شخص کا ذکر کیا ہے جو مکہ میں نوشت وخواند سے واقف تھا، اگر پیغمبر اسلام کے نوشت وخواند کے علم کو ثابت کرنے کے لیے یہ استدلال کیا جائے کہ حضرت خدیجہؓ نے آنحضرتؐ کو اپنی تجارت کا مال

ملک شام لے جانے کے لیے انتخاب کیا اور اگر آپ جاہل اور ان پڑھ ہوتے تو تجارت کے معاملات آپ کے سپرد نہ کرتیں، تو یہ استدلال مشرقیوں کے اخلاق و عادات سے ناواقفیت کا نتیجہ ہوگا، کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ عربوں کے علاوہ ہر قوم کے تاجروں میں چند امانت دار اشخاص ہیں جو نوشت و خواند سے ناواقف ہیں، اُن کی امانت و صداقت شعاری اپنے ابنائے جنس سے بیشتر ہے۔

بنابریں گزشتہ بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ انجیل مقدس پڑھی تھی اور نہ اپنے قبل کے کسی مذہب سے ہدایت پائی تھی، بخلاف اس کے اسکندر رڈیون کا یہ دعویٰ کس قدر بے بنیاد ہے کہ "آپ دینِ مسیح کی کتابوں کی نوشت و خواند سے واقف تھے" بے شک اُن ذرائع معلومات کے علم سے بحث کرنا جن سے ممکن ہے کہ آپ نے بالمشافہ مسیحیت یا یہودیت یا انجم پرستوں کے مذہب کو سیکھا ہو بعض اوقات اُن موافق گوشوں کے پہچاننے میں مفید ہو سکتی ہے جو قرآن اور توراۃ کے درمیان درپیش ہوئے ہیں، لیکن اس قسم کی بحث فرعی و ثانوی حیثیت رکھتی ہے کیوں کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ قرآن نے دیگر مقدس کتابوں سے بعض روایات نقل کی ہیں تب بھی کسی شئے کی حقیقت کے پہچاننے میں پہلا اشکال اپنی جگہ باقی رہتا ہے جو پیغمبر کی روح دینی میں گذرتا تھا، وحدانیت خدا کے متعلق یہ اعتقاد محکم آپ کے اندر کس طرح موجود ہوا یہاں تک کہ آپ کی روح و جسم پر مسلط ہو گیا۔ ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلام قبل اس کے کہ اپنی رسالت سے آگاہ کریں بےشمار مشکلات سے دوچار ہوئے اور بے پناہ نفسانی آلام و مصائب برداشت کیے،

خدا نے آپ کے اندر ایک ایسی رُوح خلق کی تھی جو دین کے لیے خالص تھی اس لیے آپ کو لوگوں سے کنارہ کش اور عزلت گزیں ہونے کی ضرورت پیش ہوئی تاکہ آپ بتوں کی پرستش اور تعددِ آلہہ کے مذہب سے گریز کریں جس کو عیسیٰیوں کی جدت نواز فکر نے تراش لیا تھا، آپ کے دِل میں اُن دونوں مذاہب سے بغض و نفرت کا جذبہ جاگزیں ہو چکا تھا، اِن دونوں مذاہب کا وجود سوئیاں بن کر آنحضرت کے پیکر میں چبھ رہا تھا، آپ کے قلب مطہر پر وحدانیت خدا کی عظیم الشان فکر کی جو جلوہ باریاں ہوئی تھیں اُن کا انفرادی مظاہرہ کرنے کے لیے آپ غارِ حرا میں عزلت گزیں ہو گئے، عنانِ فکر کو تامل و تفکر کے سمندروں کی بے پایاں جولانی کے لیے آزاد چھوڑ دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ عبادت اور تہجد گزاری کا ایک لمحہ بھی رائیگاں نہ جانے دیا، اِسی سوچ بچار میں اس سرزمین کی راتوں میں سے چند راتیں گذاریں جو روح کے اندر سرور و انبساط کی لہر دوڑاتی رہتی ہیں، یہاں تک کہ خواص اِس خطۂ ارضی کی سہانی اور لطافت بار راتوں کی تعریف میں اِس طرح رطب اللسان تھے کہ فرشتے اُس شوق و تمنا کی وجہ سے جو اِس خطۂ ارضی کی حسین و جمیل رات سے وابستہ ہے اور اُس اشتیاق و آرزو کی بدولت جو یہاں کی رات کی صفاتِ جمال و جلال سے متعلق ہے خدا سے التجا کرتے ہیں کہ اُن کو اجازت دی جائے تاکہ وہ آسمان سے نیچے اتر کر ایک رات اِس خطۂ ارضی کی آغوش میں گذاریں۔

یہ شخص جو چالیس سال کی عمر کو پہونچا ہوا ہے، فہم و ذکاء کی جلوہ بارہ

شعاعوں کے عین وسط میں ہے، اور سرزمین مشرق کے اُن اشخاص میں ایک جلیل القدر ہستی ہے جو تیزیٔ خیال اور قوتِ ادراک میں عقل وفکر میں ممتاز اور ترتیب مقدمات اور اخذ نتائج سے بے نیاز ہیں آخر کس گوشۂ کائنات اور کس خطۂ الوہیت میں غور وفکر کر رہا ہے، اُس کی فکر کا مرکز وحدانیت اللہ ہے اور اُس کی زبان یہ الہامی نغمے بار بار الاپتی ہے، "اللہ احد اللہ احد" یہ ایسے مقدس کلمات ہیں کہ آنحضرت کے بعد تمام مسلمان اُن کو وردِ زبان بنالیتے ہیں اور اُن کی حقیقت ہم عیسائیوں سے پوشیدہ ہے، کیوں کہ ہم توحید کے تصور سے دور ہیں آپ کی عقل وفکر انہی الٰہی تصورات اور ربانی نغمات میں ڈوبی ہوئی رہی، یہاں تک کہ یہ فکر مختلف صورتوں اور قالبوں میں آپ کے کلام میں ظاہر ہوئی جس کا مظہر قرآن ہے، لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ، نہ اُس کی کوئی اولاد نہ وہ کسی کی اولاد نہ اُس کا کوئی شریک اور نہ کوئی اُس کی برابری کرنے والا، عربی زبان کے مترادف الفاظ اور اُن کے دقیق معانی آپ کے لیے اِس بلند ترین فکر کے اعادہ کے لیے مساعد ہوئے، اِس اُلوہیت کی شان لیے ہوئے افکار اور عبادت کی گہرائیوں سے اسلامی کلمہ لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ پیدا ہوا ہے وہ بنیادی عقیدہ خدائے یکتا و پروردگار بے نیاز اور اُن تمام نقائص سے منزہ ہستی کا جن کا عقل تصور کر سکتی ہے، یہی وہ عقیدۂ محکم ہے جس پر مسلمان یقین رکھتے اور بصدق دل سے ایمان لے آتے ہیں

اور اسی عقیدہ کی بدولت تمام قبیلوں اور جماعتوں سے ممتاز ہیں، حقیقی معنی میں ہی مومن ہیں جیسا کہ وہ اپنی زبانوں سے اپنے آپ کو نامزد کرتے ہیں، یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ یہ عقیدہ کتاب توراۃ و انجیل کے مطالعہ سے پیغمبر اسلام کو پہونچا ہو، کیوں کہ اگر آپ اِن کتابوں کو پڑھے ہوتے تو اُن کی فوراً تردید کرتے اِس لیے کہ یہ کتابیں عقیدۂ تثلیث پر مشتمل ہیں، جو آپ کی ابتدائے آفرینش ہی سے آپ کی فطرت کے متضاد اور آپ کے ضمیر و وجدان کے مخالف ہے، لہٰذا عقیدۂ توحید کا یکبارگی ظہور آنحضور کی بدولت آپ کی زندگی میں ایک عظیم ترین مظہر ہے، یہ بذاتِ خود آپ کی رسالت کی صداقت اور آپ کی نبوّت کی امانت پر بلند و برتر دلیل ہے۔

قرآن وحی آسمانی کا مظہر قرآن کے وحی الٰہی اور الہام آسمانی ہونے کے متعلق بہت سے اشکالات اور پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں، اِس کا سبب یہ ہے کہ اہل بحث و تحقیق نے اِس دشوار گذار مرحلہ کو عبور کرنے کے لیے کوئی ایسا راستہ نہیں تراشا جو سہل اور پسندیدہ ہو، عقل حیران ہے کہ یہ آیات کس طرح ایک اُمّی اِنسان سے صادر ہو سکتی ہیں، تمام اہلِ مشرق کا اس پر اتفاق ہے کہ فکر بنی نوع اِنسان اُن آیات کی ایک مثال بھی، خواہ وہ لفظی ہو یا معنوی، پیش کرنے سے عاجز و درماندہ ہے، وہ آیات جن کو عتبہ بن ربیعہ نے سنا اور اُن کی جمال آفریں خوبیوں اور لطافت بار جلووں سے حیران و ششدر رہ گیا، اُن کی بلیغ و بلند عبارات عمر بن خطاب کو معتقد کرنے کے لیے کافی تھیں، چنانچہ وہ قاری آیات کے پروردگار پر ایمان لے آئے

جس وقت جعفر بن ابی طالب سورۂ آل عمران اور اس کی بالخصوص وہ آیتیں تلاوت کیں جو حضرت یحییٰ کی ولادت سے متعلق ہیں تو نجاشی حبشہ کی آنکھوں سے سیل اشک جاری ہوگیا اور پکار اٹھے کہ کلام کی یہ موجیں تو حضرت مسیح کے سرچشمۂ کلام سے پھوٹ پھوٹ کر نکلی ہیں، اس حکایت کا راوی کوران دی پرسوفال کہتا ہے کہ دوسرے روز نجاشی نے جعفر طیار کو طلب کیا اور ان سے خواہش کی کہ قرآن میں حضرت مسیح کے بارے میں جو کچھ وارد ہوا ہے تلاوت کریں، جعفر نے وہ حصہ جو مسیح کی شان میں وارد ہوا تھا پڑھ کر سنایا، شاہ حبش نے جب یہ سنا کہ حضرت مسیح بندہ و رسولِ خدا اور ایک ایسی روح ہیں جو خدا کی طرف سے ان کی ماں مریمؑ میں نازل ہوئی، بے حد متعجب ہوا اور ایک باریک نرکل جو اس کے روبرو پڑا تھا اٹھا لیا اور جعفر سے کہا عیسیٰ کی شان میں تم نے جو کچھ کہا وہ ہم نے سن لیا ہمارا مذہب عیسیٰ کے حق میں جو کہتا ہے اس کے اور تمہارے بیان کے درمیان فرق اس نرکل کے قطر سے بڑھ کر زیادہ نہیں، وہ نرکل قوی اور طاقت ور ہوتے ہوتے لاٹھی کی شکل اختیار کر گیا اور حبشہ میں اسلام کے داخلہ میں رکاوٹ بنا رہا، حبشہ اس دور سے لے کر آج تک دینِ مسیحی پر برقرار ہے، لیکن ہم اہل مغرب قرآن کے معنی و مفہوم کو جس طرح سمجھنا چاہیئے ویسے نہیں سمجھ سکتے کیونکہ قرآن ہمارے افکار و رجحانات کے مخالف ہے اور ہماری قوموں کی تربیت و تعلیم سے تباین و اختلاف رکھتا ہے، لیکن یہ مغائرت و تناقض اس کا موجب نہ ہونا چاہیئے کہ ہم قرآن کی اس تاثیر کے منکر ہو جائیں جو عربوں کی عقول و اذہان میں تجلیاں

بن کردوڑی، جان جاک روسو نے سچ کہا ہے کہ:۔

"بعض لوگ تھوڑی بہت عربی زبان سیکھ کر قرآن پڑھتے اور اس پر ہنستے ہیں۔ اگر وہ یہ سُن لیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم فصیح و رقّت آمیز زبان اور دلگداز اور دلکش آواز کے ساتھ قرآن کو عربوں کے سامنے پڑھتے ہیں جو ان کے کانوں میں موسیقی کی بارش برساتے اور ان کے دلوں کو لطافت بار جلوؤں سے سرشار کرتے ہیں اور بغور دیکھیں کہ جب کبھی آپ کوئی حکم صادر فرماتے ہیں اس کی قوت بیان اور سحر بلاغت سے جو آپ کو عطا ہوئی ہے تائید فرماتے ہیں تو وہ زمین پر سربسجدہ ہو جاتے اور پکار اٹھتے کہ اے پیغمبر رسولِ خدا ہمارا ہاتھ پکڑ ہم کو شرف و افتخار کے مقام پر پہونچا یا ہلاکت کی گھاٹیوں اور خطروں کی وادیوں میں پھینک دے، ہم تجھ سے سچی محبت کرتے ہیں یا تو جان دے دیں گے یا فتح پائیں گے"

بول تھیلیر کہتا ہے۔

"مشکل ہی سے انسان یہ باور کر سکتا ہے کہ انسانی فصاحت کی قوت اس درجہ اثر کرے گی

بالخصوص جب کہ وہ ہمیشہ بلند و بالاتر، بلا کسی ضعف
کے صادر اور بے پناہ بلندی و اعجاز کے ساتھ موجود
ہے اس لیے کہ کرۂ ارض پر بسنے والے انسان
اور آسمان کی پہنائیوں میں رہنے والے فرشتے
اس قسم کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہیں۔"

مؤلف اپنی کتاب میں اس آیت کی اشارہ کرتا ہے:۔

ام یقولون افتراہ قل فاتوا بعشر سور مثلہ مفتریات وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صادقین فان لم یستجیبوا لکم فاعلموا انما انزل بعلم اللہ وان لا الہ الا ھو فھل انتم مسلمون (ھود)

یا وہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اسے بنا لیا ہے، تم یہ کہدو کہ ایسی ہی بنی ہوئی دس سورتیں تم بھی لے آؤ اگر تم سچے ہو تو اللہ کے سوا تم جن جن کو بلا سکتے ہو بلا لو پھر اگر وہ تمہارے کہنے کو منظور نہ کریں تو سمجھ لو کہ جو کچھ نازل کیا گیا ہے خدا کے علم سے نازل کیا گیا ہے اور یہ کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے کیا اب بھی تم حکم ماننے والے ہو گئے۔

یہ کس طرح ممکن ہے کہ پیغمبر نے اس کتاب کو فصیح زبان میں تالیف کیا ہو، حالانکہ یہ زبان قرونِ وسطیٰ میں لاطینی زبان کی طرح ہے کہ سوائے علماء کے اس زبان کو کوئی نہیں سمجھتے۔ مجھے میورینار دوزی پر سخت تعجب ہوتا ہے کہ وہ اپنی کتاب تاریخ اسلام صفحہ ۲۰ پر کہتا ہے:۔

"قرآن میں نحوی غلطیاں زیادہ ہیں، اِن غلطیوں کو جملہ قواعد نحو سے دور یا مستثنیٰ شمار کیا گیا ہے۔"

فی الواقع مجھے نہیں معلوم کہ اس مؤلف نے اپنے اِس دعویٰ میں کونسے ماخذ پر اعتماد کیا ہے، حالانکہ قبل اسلام نحو کی کوئی کتاب ہمارے علم میں نہیں آئی، اگر فرضی طور پر ہوگی بھی تو لامحالہ حد درجہ نادر الوجود ہوگی، ہم ایسے اشخاص کو جن میں سے اکثر ان پڑھ نہ تھے، ملاحظہ کر چکے ہیں کہ انھوں نے عربوں کے درمیان کھڑے ہو کر ادعائے نبوت کیا، منجملہ اُن کے مسیلمہ نے جو اپنے کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھی جانتا تھا، چند ایسی سورتیں پیش کیں کہ عرب اُس کا مضحکہ اُڑاتے تھے، اگر قرآن کے اندر اس قسم کے روشن معانی اور خوشنما مبادی نہ بھی ہوتے تب بھی اُس کے لیے یہ کافی تھا کہ وہ افکار پر مسلط ہو جائے اور دلوں کو گرویدہ کر لے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو اپنی صدق رسالت پر دلیل ٹھہرایا قرآن آج تک ایک ایسا رازِ سربستہ ہے جس کے طلسمات کی نقاب کشائی ممکن نہیں ہے، درحقیقت یہ رازِ سربستہ صرف اسی شخص کے قلب پر آشکار ہو سکتا ہے جو اس امر کی تصدیق کرتا ہو کہ یہ خدا کی جانب سے اُتاری ہوئی کتاب ہے، مگر ہم مجبوراً مسیحیت کے مدّاحوں کے قول پر اعتماد کرتے ہیں، جس کی طرف میں اپنے ایامِ جوانی میں مائل تھا اُن کے قول کا ماحصل یہ ہے کہ

"قرآن ایک فاتح شخص کی تالیف ہے، جس نے اپنی سلطنت کی بنیادیں مضبوط کرنا چاہیں اس

مقصد کے لیے اس نے یہودیوں اور عیسائیوں
کی کتابوں سے چند قوانین جمع کر لیے، بعض اخلاقی
اور دینی اُصول و قواعد اس میں درج کر لیئے
اور اپنی رسالت کی تائید میں بطور ضمیمہ چند ہیبتناک
واقعات اور عظیم الشان تاریخی قصص اضافہ کر دیئے"

بہر حال خواہ ہم حقیقت قرآن کو پہچاننے میں کامیاب ہوں یا نہ ہوں اس سے کوئی شخص منکر نہیں کہ ظہور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ظہور نبوت ہے قطع نظر اس سے کہ یہ نبوت صادق ہو یا نہ ہو، اس لیے کہ نبوت کی حقیقت یہ ہے کہ ایک انسان امر ربانی کو دیگر انسانوں تک پہونچا دے اور فی الواقع معتقد ہو کہ وہ جو کچھ کہتا ہے خدا کی طرف سے کہتا ہے، میں جانتا ہوں کہ عیسائی عام اس سے کہ وہ متکلمین میں سے ہوں یا حکماء و اہل تحقیق سے، اس تعریف کو قبول نہیں کرتے، مگر تاہم میں نہیں چاہتا کہ اس تعریف کے اور عیسائیوں کے اقوال کے درمیان مطابقت و ہم آہنگی پیدا کروں، بلکہ اس سے میرا مقصود اُن توضیحات کے لیے ایک مقدمہ کی تمہید ہے جن کو میں اس رسالہ کے ضمن میں قارئین کے روبرو پیش کر دینا چاہتا ہوں۔

حسب بیان بالا ہمارا نظریہ ہے کہ ظہور نبوت کے لیے دو مختلف سبب ہیں، نبوت یا تو وحی آسمانی سے نشو و نما پا کر نمودار ہوتی ہے یا ذکاء ذہن اور نفس کی اندرونی شدید تحریک کا نتیجہ ہوتی ہے، ان دونوں سبب سے خواہ کوئی سبب مبدا و تاثیر ہو وہ شخص قہراً بلا کسی اختیار کے اس سے متاثر

ہوتا ہے اور ان دونوں صورتوں میں وہ راستباز ہے، نبوت جو ان میں سے کسی ایک سبب سے پیدا ہوئی ہے امرِ واقعہ کے مطابق ہوگی یا کذب و دروغ پر محمول، اگر اس کا مبداء الٰہی ہے تو حقیقی ہوگی ورنہ اس میں کذب و دروغ کا شائبہ پایا جاتا ہے، اگر ہم ان توضیحات کی طرف رجوع کریں جو حکماء و محققین نے نبوت کے متعلق پیش کی ہیں اور جن کو مسیحی متکلمین نے قبول نہیں کیا ہے تو ممکن ہے کہ ہم مؤسس اسلام کی حالت سے آگاہ ہو جائیں اور یقین کریں کہ پیغمبر اسلام جدت نواز نہ تھے، جیسا کہ اولو الانبیاء بنی اسرائیل کے متعلق کہتا ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم معتقد تھے کہ ایک روح خدا کی جانب سے آپ کی عقل پر مسلط ہوگئی ہے اور آپ ایسا محسوس کرتے تھے کہ آپ کی نظر و فکر اپنی ذاتی و شخصی نہیں ہے بلکہ خدا کی طرف سے آپ کو عطاء کی گئی ہے اور اپنی شخصیت آپ کی نظر سے مخفی ہوگئی، کوئی آواز آپ کو سنائی نہیں دیتی بجز ذاتِ واجب الوجود اور اپنے سے برتر و مافوق ہستی کی آواز کے، ہمیں یہ سمجھنا مشکل ہے کہ آپ جبرئیل کی آواز کو کس طرح سنتے تھے، آیا یہ آواز خواب میں سنائی دیتی یا ایسے حال میں کہ آپ تصورات الٰہیہ کے عالم میں ڈوبے رہتے، حالانکہ اس مسئلہ کے سمجھنے سے موضوع میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہو جاتی، اس لیے کہ بہر حال آنحضرت کی صدق رسالت اپنی جگہ بحال ہے؛

اسی طرح اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ قرآن خدا کا کلام نہیں بلکہ محمد کا کلام ہے تو ہم کو ان دونوں مفروضوں کے باوجود لا محالہ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ آیاتِ بینات ایک جدت طراز شخص کی دماغی کاوشوں اور

فکری کوششوں کا نتیجہ نہیں ہو سکتے، لیکن جو شخص آنحضرت کی نبوت کی تکذیب کرتا ہے اس کا عقیدہ اس کے خلاف ہوگا اور ان آیاتِ بیّنات کو انسانی کوششوں کا ماحصل ٹھہرائے گا۔

ہم جانتے ہیں کہ پیغمبرِ اسلام جو آواز سنتے تھے وہ اس آواز کے مشابہ ہے جس نے آپ سے قبل ایوانس کو بیدار کیا اور پیغمبرِ اسلام سے کہا

یا ایھا المدثر قم فانذر
وربك فكبر وثيابك فطھر
والرجز فاھجر۔

آپ نے جب یہ آواز سنی تو توقف فرمایا اور آواز پر لبیک نہ کہا، اس کے بعد آپ کے ذہن و دماغ پر حیرت کا عالم طاری ہوگیا اور دل پر خوف و دہشت مسلط، یہاں تک کہ جب امر ربانی ظاہر و آشکار ہوگیا اور انسانوں کو بشارت دی تو آپ کو قدرے سکون و آرام میسر ہوا تاہم بالکلیہ تسکین نہ پائی اس لیے کہ آپ حد درجہ طول خاطر ہو گئے تھے، جیسا کہ سورۂ صود و قارعہ و حاقہ سے معلوم ہوتا ہے۔

اس وقت سے آنحضرت کے لبہائے مقدس پر چند ایسے الفاظ جاری ہونا شروع ہوئے جن میں سے بعض الفاظ دوسرے الفاظ سے قوی و بلند تر تھے، اور مسلسل افکار آپ کے دہان مبارک سے آبشار کی طرح نازل ہوتے تھے، یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا یہاں تک کہ آپ کی زبان گفتگو سے رک جاتی

آواز بند ہو جاتی اور کوئی ایسا لفظ نہیں پاتے جس سے اِس فکر کی تعبیر کی جا سکے جو انسانی احساسات سے بالاتر اور قلم و زبان کی موشگافیوں سے ماوراء ہے' وحی الٰہی کے یہ تاثرات اور الہامِ آسمانی کے یہ کیفیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ اقدس پر ظاہر ہوتے تھے' بعضوں نے اُن سے گمان کر لیا کہ آپ مجنون ہیں' حالانکہ یہ عقیدہ باطل ہے اِس لیے کہ آنحضرت م کی عمر کا چالیسواں سال شروع ہو گیا اب تک کوئی بیماری جسم میں اور کوئی خرابی آپ کی جسمانی قوت میں مشاہدہ میں نہ آئی' اور آنحضرت کی طرح کوئی ایسا شخص انسانی گروہ میں پیدا نہ ہو گا جس کے آغازِ حیات سے دمِ ممات تک کے تمام حالات سے لوگ واقف ہوں' یہاں تک کہ صحابہ آنحضرت کے حالات و اخبار کو بیان کرتے ہوئے اِس درجہ تک پہنچ گئے ہیں کہ ایک سفید بال کو جو آپ کی ریشِ مبارک میں تھا بیان کرتے ہیں' اگر آپ مریض ہوتے تو آپ کا مرض کسی سے مخفی نہ رہتا' کیوں کہ اہلِ مشرق اِس قسم کے مرض کو' جس میں یہ تمام آثار و علامات پائے جاتے ہیں' امرِ آسمانی قرار دیتے ہیں' محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا شدّتِ تاثرات و انفعالات سے جو حال ہو جاتا تھا وہ مجنونانہ نہ تھا' یا وہ آپ کے مجنون ہونے کی وجہ سے نہ تھا بلکہ وہ بعینہٖ وہی تھا جس کا وصف پیغمبر بنی اسرائیل اِس طرح کرتا ہے۔

"مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرا دل آرے کے دندانوں سے چیر اگیا' میری ہڈیاں مرتعش ہو گئیں' میں اُن احساسات کی بدولت جو صورتِ ربانی اور

اور اقوال مقدسہ الٰہی کو سنتے وقت محمد پر طاری ہوئے،
بدمست انسان کی طرح ہو گیا۔"

آنحضرتؐ جدت طراز نہ تھے

ہمارے مذکورۂ بالا بیانات کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو جدّت طرازوں میں سے تھے اور نہ اُن اشخاص سے جو کذب و دروغ آمیز کتاب پیش کرتے ہیں، آپ غارتگر پیغمبر بھی نہ تھے جیسا کہ ہوسیو سیاوس نے ذکر کیا ہے، بے شک ہم بعض مواقع اور مقامات میں قرآن اور تورات کے مابین مشابہت پاتے ہیں، لیکن اس مشابہت کے سبب کا معلوم کرنا سہل ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ آنحضرتؐ دین اسلام کو مسیحیت و یہودیت سے مربوط و ہم آہنگ تصور کرتے تھے، ہم اس امر میں بحث کرنے کے روادار ہیں کہ آیا آپ کا طریقہ صحیح تھا یا یہ کہ آپ نے حقیقت دین کی تائید کے لیے یہ طریقہ وضع کر لیا تھا، لیکن ہم اس حقیقت کو کہ آپ... اپنے دین کو مذکورۂ بالا دو مذاہب سے نزدیک و مربوط جانتے تھے قبول نہیں کرتے، اس صورت میں کوئی تعجب نہیں ہے اگر یہ کتابیں بعض مقامات میں ایک دوسرے سے مشابہت رکھیں بالخصوص جب کہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ قرآن ان کتابوں کی تکمیل کے لیے آیا ہے جیسا کہ پیغمبر اسلام خاتم الانبیاء و مرسلین بنا کر مبعوث کیے گئے۔

[ادیانِ ثلاثہ کے باب میں پیغمبر اسلام کے دین کا جو حال ہے اس کو ہم بطور خلاصہ بیان کرتے ہیں، تمام انبیاء کا دین ایک تھا حضرت آدم کے زمانے سے آنحضرتؐ کے دور تک تمام انبیاء ایک ہی مذہب پر قائم تھے، تورات،

انجیل اور قرآن یہ تین مقدس کتابیں ہیں جو آسمان سے نازل ہوئیں، قرآن کی نسبت انجیل سے ایسی ہی ہے جیسی کہ انجیل کی نسبت توریت سے، یا محمدؐ کی نسبت حضرت عیسیٰ سے ایسی ہے جیسی کہ حضرت عیسیٰ کی نسبت موسیٰ سے، اہم دریافت طلب امر یہ ہے کہ قرآن آسمانی کتابوں میں آخری کتاب ہے، جو انسانوں کے لیے نازل ہوئی، اور صاحب قرآن خاتم انبیاء و مرسلین ہے، بنا بریں قرآن کے بعد نہ کوئی کتاب اترے گی اور نہ محمدؐ کے بعد کوئی پیغمبر مبعوث ہوگا، نیز آنحضرت کے بعد نہ تو کلماتِ الٰہی میں کوئی تغیر و تبدل پیدا ہوگا، اس مفہوم کی وضاحت کے بعد اگر فی الجملہ قرآن و انجیل کے مابین کوئی مشابہت نظر آئے تو کوئی تعجب نہ ہوگا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عیسیٰ کی مانند ہی فرمایا کہ آپ گذشتہ انبیاء کی رسالت کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوئے ہیں نہ اس لیے کہ انبیاء سابقین کی رسالت کا خاتمہ کر دیں، اس لحاظ سے آپ کا طریقہ انبیاء سابقین سے بعد مسافت تلاش کرنا نہ تھا، اس لیے آپ ہمیشہ اس کی تصریح فرماتے تھے کہ آپ کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ انبیاء سابقین پر جو احکام نازل ہوئے ہیں انسانوں کے روبرو انہی کا اعادہ آپ کریں، آسمان کی فضائے بسیط سے بھی یہی الہامی آواز آپ سنتے ہیں۔

انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح والنبیین من بعدہ واوحینا الی ابراھیم واسماعیل	ہم نے آپ کے پاس وحی بھیجی ہے جیسے نوح کے پاس بھیجی تھی، اور ان کے بعد اور پیغمبروں کے پاس، اور ہم نے ابراہیم، اسماعیل، اسحٰق،

وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ عِیْسٰی وَ اَیُّوْبَ وَ یُوْنُسَ وَ هٰرُوْنَ وَ سُلَیْمٰنَ وَ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا وَ رُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَیْكَ مِنْ قَبْلُ وَ رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَیْكَ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰی تَكْلِیْمًا رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ۝ (النساء)

یعقوب، اولاد یعقوب، عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان کے پاس وحی بھیجی تھی، اور ہم نے داؤد کو زبور دی تھی، اور ایسے پیغمبروں کو صاحب وحی بنایا جن کا حال اس کے قبل ہم آپ سے بیان کر چکے ہیں، اور ایسے پیغمبروں کو جن کا حال ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا اور موسیٰ سے اللہ نے خاص طور پر کلام فرمایا، ان سب کو خوشخبری دینے والے اور خوف سنانے والے پیغمبر بنا کر اس لیے بھیجا تاکہ لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کے سامنے ان پیغمبروں کے بعد کوئی عذر باقی نہ رہے اور اللہ تعالیٰ پورے زور والا اور بڑی حکمت والا ہے۔

ایک اور مقام پر الہامی نغمہ اس طرح گونجتا ہوا سنائی دیتا ہے۔

وَ مَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْۤ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۔ (انبیاء)

اور ہم نے تم سے پہلے ایک رسول بھی ایسا نہ بھیجا کہ اس کی طرف ہم یہ وحی نہ کرتے رہے ہوں کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے پس تم میری ہی عبادت کیا کرو۔

وما ارسلنا من قبلك الا رجالاً نوحی الیهم فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون بالبینات والزبر وانزلنا الیك الذکر لتبین للناس ما نزل الیهم و لعلهم یتفکرون ۔

(النحل)

اور اے رسول تم سے پہلے ہم نے آدمیوں ہی کو کتابوں اور معجزوں کے ساتھ بھیجا تھا جن کی طرف ہم وحی کیا کرتے تھے پس (ان سے کہدو کہ) اگر تم نہیں جانتے تو اہل الذکر سے پوچھ لو اور تمہاری طرف یہ قرآن نازل کیا تاکہ جو کچھ تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے اُسے تم لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دو کہ وہ غور و فکر کریں ۔

علاوہ ازیں قرآن اور توریت و انجیل کے درمیان بعض مقامات پر جو مشابہت پائی جاتی ہے ہماری گزشتہ بالا توجیہ کی محتاج نہیں ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ روح محمدؐ اسی اثر سے متاثر تھی جس سے انبیاء بنی اسرائیل کی روحیں متاثر تھیں آپ اسی خدائے واحد کی عبادت کرتے تھے جس کی وہ انبیاء انجام دیتے تھے، لہٰذا اگر قرآنی دعاؤں اور التجاؤں کے الفاظ دوسری آسمانی کتابوں سے متشابہ و مماثل ہو جائیں تو کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔

بنا بریں آنحضرتؐ کی زندگی کے پہلے دور میں آپ کے کمال ایمان اور صدق اخلاص کا انکار ممکن نہیں، باقی آپ کے دوسرے دور کا ایمان تو وہ ذرہ برابر آپ کے گوشۂ قلب سے خارج نہیں ہوا اگر یہ بات نہ ہوتی کہ

آپ کا اعتقاد اس درجہ پر پہونچ چکا تھا کہ مزید اضافہ کی اس کے اندر گنجائش نہ تھی تو جو فتح وغلبہ آپ کے لیے حاصل ہوا آپ کے ایمان کو تقویت بہم پہونچانے کے لیے کافی تھا، آپ کے اندر کوئی عیب اور کوئی نقص نہ تھا، بلکہ اس قسم کے جو عیب اور نکتہ چینیاں آپ کی ذات سے وابستہ کی گئی ہیں آپ کی سیرت پاک کا دامن ان تمام آمیزشوں سے پاک ہے، آپ زینت بخش مظاہر دنیوی کی طرف مائل نہ تھے، بخیل نہ تھے، بلکہ ابو الفداء کے قول کے مطابق اپنی بکریوں کا دودھ دوہتے تھے، فرش خاک پر بیٹھتے، اپنے کپڑے اور جوتے اپنے ہاتھ سے سیتے اور پیوند لگے ہوئے کپڑے اور جوتے پہنا کرتے تھے۔

ابو ہریرہؓ کی روایت کے مطابق آپ اس دار فانی سے اس حالت میں رحلت فرما گئے کہ اپنی تمام عمر میں ایک دفعہ بھی جو کی روٹی شکم سیر ہو کر نہ کھائی، یہ ہے وہ جلیل المرتبت پیغمبر کہ جس کے متعلق مسیحی افسانہ خواں کہتے ہیں۔

"حریص تھا، میخانوں میں راز کی باتیں کہا کرتا تھا"

حالانکہ آپ حرص وآز کے جذبات سے پاک تھے، بلاد عرب میں بلند مقام پر پہونچ سکتے تھے مگر ان ممالک میں استبداد کی طرف توجہ تک نہ کی اپنے لیے حشم وخدم اور لوازم نہ رکھے، مال وجاہ کو حقیر سمجھتے تھے، منتہائے سلطنت پر فائز ہونے کے باوجود حکومت وامارت کی نشانیوں میں سے آپ کے پاس سوائے چاندی کے عصا کے اور کوئی چیز نہ تھی، اس عصائے سیمیں پر لکھا ہوا تھا محمد رسول اللہ آپ کے اندر کوئی عیب نہ تھا،

بجز اس کے جو آفرینش انسان کی ساخت و بنیاد میں ہوا کرتا ہے، رونان کہتا ہے۔

"انسان کمزور پیدا ہوا ہے، اس کے اندر اتنی
تاب و طاقت نہیں کہ رسالت الٰہی کی امانت کو
زیادہ مدت تک برداشت کرے جس شخص کی
مدت رسالت کم ہوگی وہ ابرار و معصومین کے زمرہ
میں سے ہوگا۔"

رونان باوجود اپنے اس بیان کے پیغمبر اسلام کی صدق رسالت پر ایمان نہیں رکھتا:

علاوہ بریں اگر یہ صحیح ہو کہ آپ کے اندر کچھ عیوب تھے، اور ہر چند آپ کی طرف جو عیوب منسوب کیے گئے ہیں وہ گھناؤنے ہی کیوں نہ ہوں، مگر آپ کی رسالت کی شان میں کوئی خدشہ اور کوئی خلجان پیش نہیں کرتے، اس کا سبب یہ ہے کہ حتمی طور پر یہ لازم نہیں کہ جس شخص کو خلعت نبوت سے سرفراز اور وحی الٰہی کا مورد قرار دیا جائے وہ کسی انسانی شائبہ و عیب سے خالی ہو، حضرت داؤد کو دختر صابا کے معاملہ میں لغزش ہوئی حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ انبیاء بنی اسرائیل حضرت داؤد ہی کی مبارک نسل سے تھے، پھر اللہ تعالیٰ چند ایسی نشانیاں روانہ کرتا ہے کہ فکر انسانی ان میں حیران و ششدر رہ جاتی ہے، ہر چند ہم ان آیات کے کسی ایک جزو اور کسی ایک گوشہ کا ادراک کرنے کی جد و جہد کریں مگر پھر بھی جہالت کی تاریکیوں میں ٹھوکریں کھاتے ہیں، خدا نے شاہان بنی اسرائیل سے وعدہ کیا کہ حضرت مسیح کو ان کی نسل سے مبعوث کرے گا، لیکن ہم نے

مشاہدہ کیا کہ حضرت عیسیٰ اُس ترتیب و دستور کے خلاف جو اُن کے ذہن میں مرتسم تھا بن باپ کے روح القدس کے انفاس اور کلمۂ الٰہی کے طفیل پیدا ہو گئے علاوہ بریں محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے حق میں فرماتے تھے کہ عذاب الٰہی سے خوف کھاتے تھے، خدا سے بخشش کے طلبگار تھے، جس وقت مکرر قیامت کبریٰ کے آیات تلاوت فرماتے تھے آپ کے چہرہ پر علامات فزع و ہیبت نمودار ہونے لگتے تھے؛

پھر بھی آپ راستباز رہے۔ یہاں تک تو پیغمبر اسلام کی صداقت و امانت کا بیان تھا جس کا مظاہرہ آپ نے اپنی بعثت کے ابتدائی زمانے میں کیا، یہاں تک کہ آپ کے معاصرین آپ کو امین کے لقب سے نامزد کرتے تھے، باقی رہا پیغمبر کا حال آپ کی باقی زندگی کی مدت میں کیا تھا جب کہ آپ سیاسی حکومت کے مالک بن گئے اور وسیع اختیارات کی زمام آپ کے ہاتھوں میں آگئی تھی، پھر اِس دَور میں آپ کی صداقت و امانت پر استدلال وغیرہ اِن تمام امور کے لیے زیادہ دقت نظری اور تفصیلی بحث و جستجو کی ضرورت ہے، رینارڈوزی کہتا ہے:-

> "قطعی طور پر یہ کہنا تقریباً محال ہے کہ محمدؐ اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنی صدق رسالت پر عقیدہ رکھتے تھے، باقی رہا پہلے دَور میں آپ کے اعتقاد و صدق رسالت میں تو کوئی شک و شبہ نہیں۔"

مسئلہ کے اِن دونوں پہلوؤں پر بے شمار دلائل ہیں، اہل بحث و تحقیق

کے درمیان اس موضوع کے عنوان کی کیفیت پر بہت سے اختلافات پیدا ہوگئے
ہر فریق نے اپنے میلان و رجحان کے مطابق اپنی اپنی رائے و تحقیق کو ترجیح دیکر
تقویت بہم پہونچائی ہے، لیکن جو شخص دقیق النظر اور منصف مزاج ہو اس
کیلئے یہ لازم نہیں کہ کسی قول کو دوسرے قول پر ان قرائن و آثار کا مشاہدہ
کیے بغیر جو دونوں پہلوؤں میں موجود ہیں، ترجیح و فوقیت دے، اگر موسیو مونٹو
کے قول کے مطابق لوگ یقین و اعتقاد کے محتاج ہیں، اس ضرورت کو پورا
کرنے کیلئے وہ کسی ایسے شخص کی طرف مائل ہیں جو مسائل کو حقیقت
ثابتہ کی صورت میں ان کے روبرو بیان کرے، اور ایسے شخص کے دشمن
ہیں جو ان کو بدون کسی دلیل و حجت کے نفی و اثبات کے عقیدہ سے باز
رکھتا ہے، میں بھی دعویٰ نہیں کرتا کہ اس سرزنش سے بیرون ہوں؛
لیکن میرا دعویٰ یہ ہے کہ اگر ان دونوں مذاہب کی صحت کو تسلیم کرلیا جائے
نیز یہ فرض کرلیا جائے کہ پیغمبر اسلام کی زندگی کے آخری دور میں آپ کی صداقت
رسالت و عدم صداقت بحیثیت وضاحت و دلیل یہ دونوں رخ مساوی
ہیں تب بھی اس صورت میں ہمارے نزدیک منزل حقیقت تک پہونچنے
یا اس کے قریب ہونے کا ایک اور راستہ ہے اور وہ ہے علم نفس اور تحریکات
نفس، یہ علم اگرچہ اب تک اس درجہ تک نہیں پہونچا ہے جو پردہ افکار سے
شکوک و شبہات کے گرد و غبار کو زائل کردے، لیکن اس کے باوجود وہ
ہم کو شک و وہم کے دلدل سے نکال کر یقین و ایمان کی مستحکم چٹان تک
پہونچاتا ہے کیوں کہ بعض انبیاء ایسے گذرے ہیں کہ ارباب بحث و تحقیق

کے لیے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ انبیاء کے معاملہ میں یقین رکھیں مثلاً یہ کہ وہ یقین و اذعان کے ساتھ یہ کہیں کہ یہ انبیاء صادق تھے اپنے اعمال و حرکات کو خلاف واقع پیش کر چکے ہیں حالانکہ اُن کے کارنامے سیاست کاروں کے کارناموں کی طرح رہ چکے ہیں، کوئی مصنف و مورخ یا محقق اس امر کا یقین نہیں کر سکتا کہ شہنشاہ قسطنطین جس کو پادریوں نے کلیساؤں میں بلند مقام پر پہنچا دیا تھا اور اس کے لیے عطا ہائے الٰہی کو مخصوص کر دیا تھا، میلفیوس کے پل پر غلبہ و تسلط پانے کے بعد اپنے دعویٰ میں صادق رہا ہو، لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام مدت حیات ایک عزم صادق اور جذبہ محکم کے ساتھ بت پرستی کا مقابلہ کیا، وقت کا ایک لمحہ عمر کی ایک گھڑی بھی ایسی نہ گذری کہ بت پرستی اور خدائے واحد کی پرستش کے درمیان دو کی ایک ہلکی سی لہر بھی آپ کے دل میں دوڑی ہو، جیسا کہ بادشاہ روم کو تذبذب و تردد لاحق ہو گیا تھا، پیغمبر اسلام کا ایمان ہمیشہ مستحکم و برقرار تھا، یہی وجہ ہے کہ آپ کے غیرت کے سمندر کی موجوں کو ایک لمحہ بھی قرار و سکون اور آپ کے کوہ عزیمت و عظمت میں ذرا بھی جنبش و حرکت واقع نہ ہوئی، جس شان و متانت کے ساتھ آپ کا آغاز ہوا تھا اسی شکوہ و تمکنت سے آپ کا انجام بھی ہوا، اگر آپ کے دور کے ایک لمحہ میں آپ کی فکر و بصیرت پر آپ کی صداقت رسالت کے باب میں کوئی خلجان گذرا بھی تھا تو آپ کا دائمی غلبہ و اقتدار اس کے لیے کافی تھا کہ اس شک و شبہ کی پرچھائی کو یقین و ایمان کے جلوؤں سے بدل دے اور رسالت کی صداقت شعاری و راستبازی اس کی تائید کرے ۔

صداقت کے چند مدارج ہیں، قبل اس کے کہ از باب بحث و تحقیق اپنے خطا اندیش نقطہ نظر سے بدعتوں اور جدتوں کے متعلق فیصلہ صادر کر دیں۔ ان مراتب و درجات سے اُن کو آگاہ ہو جانا اور ان کو سمجھ لینا چاہیئے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طویل مدت تک اپنی قوم کی جو آپ کی رسالت کی منکر تھی؛ سختیاں اور درشتیاں برداشت کیں، جب وہ آپ پر ایمان لے آئی تو آپ نے اُن کے معتقدات و افکار سے یوں ہی چشم پوشی نہیں فرمائی، ہم صرف اقوال کی تصدیق نہیں کرتے، بلکہ یہ جانتے ہیں کہ پیغمبر کی قوم آپ کے مقام امانت میں افراط کرتی تھی، اگر آپ کبھی تقریر میں جو بطور ابہام کچھ کہتے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ایسا شخص شاذ و نادر دیکھنے میں آیا ہے جو اللہ سے محبت رکھتا ہو اور حالات و حادثات اس کو مجبور نہ کرتے ہوں کہ منکروں کے ذہن و دماغ میں اپنے مقصد و مدعا کو جاگزیں کرنے کے لیے کنایہ و ابہام سے گفتگو کرے، جو لوگ اس کے منکر ہیں کہ آنحضرتؐ اپنی زندگی کے آخری ایام میں صادق نہ تھے وہ اس کا کسی طرح انکار نہیں کر سکتے کہ آپ اپنی عمر کے آخری لمحہ تک میں رسالت و نبوت کی صفت پر باقی تھے اور اپنے مذہب و اصول کے سخت پابند، آپ نے دنیا سے اپنے دل میں یہ یقین محکم لیے ہوئے رحلت فرمائی کہ آپ نے اپنی رسالت کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے، جملہ مورخین اُن حوادث پر اتفاق رکھتے ہیں، جو آخری زمانے میں آپ کے لیے پیش آئے، نیز انھوں نے آنحضرت کے تمام حرکات و سکنات کو بلا اختلاف ہمارے سامنے اس طرح پیش کر دیا ہے، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنی خبریں ہم پہونچانے

اور حالات و واقعات قلمبند کرنے میں راستباز اور دیانت دار ہیں، اگر مسیحی قصیدہ خوانوں کے دل میں کھوٹ اور ان کے ہرزہ سرا خیالات کا ہجوم نہ ہوتا تو ہرگز آنحضرتؐ کی وفات اور آپ کی شان میں ایسے گستاخانہ الفاظ استعمال نہ کرتے جن کے سننے سے مقدس روحیں کانپ اٹھتی ہیں اور یہ ایسے مجرمانہ کلمات ہیں جن کو کوئی مذہبی روح قابل معافی شمار نہیں کرتی، قارئین یہ سنکر تعجب کریں گے کہ آنحضرتؐ کی وفات کی رسوا کن روایت جیبیر دی نوجان کی کتاب "صلیبی جنگوں کی تاریخ" میں نظر آتی ہے، اس مورخ کا شمار ان تاریخ نویسوں میں ہوتا ہے جو تاریخ میں کسی قسم کی تحریف یا تبدیلی کو پسند نہیں کرتے لیکن ایسے بلند آہنگ مورخ کے قلم سے یہ جھوٹ موجب حیرت و استعجاب ہے، علاوہ ازیں اس نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ مسلمان آنحضرتؐ کی وفات کے منظر کو دیکھنے کے بعد سے خنزیر کا گوشت حرام و مکروہ سمجھتے ہیں، ہمارے لیے مناسب یہ ہے کہ اس قسم کے دردناک افسانوں پہ پردۂ نسیان ڈال دیں اور آنحضرتؐ کی وفات کی کیفیت کا معتبر و راستباز مورخین کی کتابوں سے مطالعہ کریں۔

وفات آنحضرت

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ کے قویٰ کمزور پڑ گئے اور ماہ مارچ ۶۳۲ء میں حج کے ارادہ سے نکلے، یہ حج حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے انسانوں کے بے پناہ ہجوم میں مسجد مقدس کے منبر پر خطبہ دیا اور فرمایا یہ در دگارا میں نے آج اپنی رسالت کا حق ادا کر دیا اور اپنی امانت انسانوں تک پہونچا دی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشوھم واخشون، الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا ۔
(مائدہ)

آج کافر تمہارے دین سے نا اُمید ہو گئے اِس لیے تم اُن سے نہ ڈرو، بلکہ مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کی تکمیل کر دی، اور تم پر اپنی نعمت پُوری کر دی، اور تمہارے لیے دِین اِسلام پسند کیا۔

آپ حج کے بعد مدینہ واپس ہوئے، اور اپنی اَزواجِ مُطہرات کی رضامندی سے حضرت عائشہ رضؓ کے حجرہ میں جو تمام اَزواج میں برگزیدہ خاتون تھیں قیام فرمایا، جب موت کی قربت کا احساس ہوا تو فقرا و مساکین کو یاد کرنے لگے ۔ کیوں کہ آپ کو اپنی زندگی بھر مال سے ذرا بھی رغبت و دلبستگی نہ تھی، جب کبھی مال آپ کے پاس جمع ہوتا اُس کو صدقات میں خرچ کر دیتے، حضرت عائشہ رضؓ کے پاس تھوڑی رقم محفوظ رکھوائی تھی، زمانۂ مرض میں حکم دیا کہ اِسی وقت یہ رقم فقیروں میں تقسیم کر دی جائے، پھر آپ بے ہوش ہو گئے، جب ہوش میں آئے تو حضرت عائشہ رضؓ سے دریافت کیا کہ آپ کے حکم کی تعمیل ہوئی یا نہیں جواب دیا کہ ابھی تعمیل نہیں ہوئی، آپ نے حکم دے کر رقم منگوالی اور فقرا و مساکین کو بلوایا اور یہ رقم اُن میں تقسیم کر دی اس کے بعد فرمایا "اب میرے دل کو تسکین ہوئی کیوں کہ میں اندیشہ ناک تھا کہ میں خدا سے ایسے حال میں مُلاقات کروں کہ میرے پاس اتنی رقم رہ جائے۔

مرض کے زمانے میں ہر دن نماز ظہر کے لیے حجرہ سے باہر تشریف لاتے تھے، آخری روز جب کہ آپ نماز کے لیے باہر آئے جنوری کا مہینہ ۶۳۲ء آپ کے لیے نقل و حرکت دشوار ہوگئی تھی، فضل بن عباس اور علی بن ابی طالب کا سہارا لے کر نماز کے قبل خطبہ دینے کے لیے منبر پر گئے، یہ وہی منبر تھا جس پر ہمیشہ آپ خطبہ دیا کرتے تھے، پھر بلند آواز سے جس کو مسجد کے باہر کے لوگوں نے بھی سنا، وعظ فرمایا، دورانِ خطبہ میں ارشاد فرمایا " لوگو! جو میری باتیں سُن رہے ہو! جس شخص کی پیٹھ پر میری طرف سے ایک مار بھی پڑی ہو وہ میرے پاس آئے، میری پیٹھ اس کے لیے حاضر ہے، مجھ سے انتقام لے، اگر میں نے کسی کی بدگوئی کی ہے تو اس کی تلافی کر لے، اگر میں نے کسی کا کچھ لے لیا ہے تو وہ میرے مال میں سے لے، میرے غصہ سے محفوظ ہو جائیگا، کیوں کہ بغض و کینہ سے میرا دل کوسوں دور ہے" اس کے بعد آپ منبر سے اُترے اور جماعت کو نماز پڑھائی، جب آپ نے واپس ہونے کا ارادہ کیا تو ایک شخص نے آپ کا دامن تھام لیا اور تین درھم کا مطالبہ کیا جو آنحضرتؐ کے ذمہ رہ گئے تھے آپ نے فوراً وہ درھم ادا کر دیئے، اور فرمایا " دنیا کی رسوائی آخرت کی ذلت و خواری سے بدرجہا سہل ہے، پھر آپ نے اُن اشخاص کے لیے دعا کی جو غزوۂ احد میں آپ کے ساتھ شریک تھے، ان کے لیے رحمت و مغفرت طلب کی، آنحضورؐ اُس روز بے حد وقار و جلال میں تھے، لوگ زہر کے اثر کو، جسے آپ نے خیبر میں ایک یہودیہ کے ہاتھ سے نوش فرمالیا تھا، رخسارِ مبارک پر مشاہدہ کر رہے تھے، اُن کے دل آنحضورؐ کے ساتھ

فرطِ محبت کی وجہ سے پھٹنے جا رہے تھے، زہر خورانی کا واقعہ یہ ہے کہ غزوہ خیبر میں ایک یہودی عورت زینب نے ایک زہر آلود بکری کا بھونا ہوا گوشت آنحضرتؐ کے سامنے پیش کیا، آپ نے ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھا، جب آپ کو احساس ہوا کہ یہ زہر آلود ہے تو زبان سے نکال کر پھینک دیا، ایک عرصہ کے بعد جب کہ آپ کی وفات کا وقت قریب آپہونچا فرمایا "مسلسل خیبر کی خوراک کا اثر مجھ پر ظاہر ہو رہا ہے"۔ ادھر ابوبکر اشکباری میں مصروف تھے۔ آنحضرتؐ سے فرماتے تھے "کاش ہماری جان آپ کی جان پر قربان ہو جائے" اس کے بعد صحابہؓ نے آپ کو حضرت عائشہؓ کے گھر پہونچایا، آپ کمزور اور نڈھال ہو کر سو گئے، مرض شدید ہوتا جا رہا تھا، نماز کے وقت حاضر ہونے کی تاب و توانائی نہ تھی، صحابہؓ نے عرض کیا نماز ظہر کا وقت آگیا، آپ نے حضرت ابوبکرؓ کی طرف اشارہ فرمایا کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں، یہ اشارہ تھا حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا جو آنحضرتؐ کے بعد خلیفہ ہونے والے تھے، حضرت عائشہؓ آنحضرتؐ کی وفات کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتی ہیں۔

"رسولِ خدا کا سر میرے سینہ پر ٹکا ہوا تھا پانی کا پیالہ آنحضرتؐ کے قریب تھا، آپ اٹھ بیٹھے اور اپنا ہاتھ پیالہ میں ڈال کر اپنی پیشانی پر پھیرا، اور فرمایا "خدایا مجھے سکراتِ موت کے لمحات برداشت کرنے کی توفیق دے، اے جبرئیل میرے نزدیک ہو جاؤ، پروردگار مجھے بخش دے مجھے اپنے رفیقوں کے ساتھ آسمان میں اکٹھا کر دے" اس کے بعد سر مبارک سخت ہو گیا اور میرے سینہ پر ڈھل گیا"۔

آنحضرت کی میراث بس ایک گھر تھا جس کو اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا تھا اور چند اونٹ تھے جو بیت المال کا ایک جزو بن گئے، اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تھا "ہم گروہ انبیاء کی کوئی میراث نہیں"۔

ہم آنحضرت کی شخصیت و کردار کے احوال کے بیان کرنے میں اسی حد تک اکتفا کرتے ہیں، آنحضرت کے تفصیلی حالات پیش کرنے سے ہمارا مقصود یہ تھا کہ اس روح کی حقیقت سے ہم روشناس ہو جائیں جو دین داری اور تقویٰ شعاری سے لبریز ہے، اس لیے قبل ازیں کہ ہم آنحضرت کے دین اور ابتدائی عہد سے لے کر موجودہ دور تک اسلام کی نشر و اشاعت کی کیفیت پر گفتگو کریں ہمارا یہ فریضہ تھا کہ آنحضرتؐ کے صدق رسالت اور عقیدۂ نبوت پر تحقیق و تدقیق کے ساتھ بحث کر دیں۔

باب دوم

اسلام دورِ فتوحات میں

اور

عربوں کی مدتِ حکومت

اسلام کے خلاف ممالکِ عرب کی بغاوت و سرکشی

مقدس پولس کا قول ہے کہ یہود ایمان لانے کے لیے معجزہ مانگتے اور اہلِ یونان دلائل و براہین کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن عرب بلا معجزہ و دلیل ایمان لاتے ہیں، اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلام ہمیشہ اپنے ہمنشینوں سے فرمایا کرتے تھے کہ آپ انہی کی طرح ایک بشر ہیں جو ان کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں:

قل اِنما اَنا بشر مثلکم یُوحی | آپ کہدیجئے کہ میں تو تم ہی جیسا بشر ہوں

الیٰ اِنما الھکم الٰہ واحدٌ (الکھف)	میرے پاس بس یہ وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔
قل لا املك لنفسی نفعا ولا ضرا الا ما شاء اللّٰہ ولو کنت اعلم الغیب لا ستکثرت من الخیر وما مسنی السوء ان انا الا نذیر وبشیر لقوم یومنون۔ (الاعراف)	تم یہ کہدو کہ سوائے اتنے کے جتنا اللہ کو منظور ہے میں تو اپنی ذات کیلیے نہ ضرر کا مالک ہوں نہ نفع کا، اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو بہت سی خیر و خوبی اکٹھی کرلیتا اور خرابی تو مجھکو چھو بھی نہ جاتی مگر میں تو ان لوگوں کیلیے جو ایمان رکھتے ہیں فقط ایک خوشخبری دینے والا اور ڈرانیوالا ہوں۔

باقی رہا دلائل و براہین کا مطالبہ تو ہمیں جہاں تک علم ہے پیغمبر کی عقل و فکر اپنی امت کی طرح، جس کی طرف آپ مبعوث کیے گئے تھے تخیلات ذہنی سے دور تھی، لیکن اس کے باوجود ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ غزوۂ بدر جو ۲ھ میں پیش آیا، پیروان اسلام کی تعداد تین سو چودہ سے زیادہ نہ تھی ایک صدی بھی نہ گذری تھی کہ اسلام آلپ کے پہاڑوں کا سینہ چاک کرتے ہوئے فرانس کے وسطی ممالک تک پہونچ گیا، اس دوران میں شام، ایران مصر، مراکش سے الجزائر تک کے بلاد مغرب اقصیٰ تیونس اور طرابلس یہ تمام ممالک حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے، لیکن اسلامی نشر و اشاعت کا یہ دائرہ جس قدر بڑا تھا اس سے بیشتر اسی پیمانہ میں اسلام کو بے پناہ اضطراب و

مشقت کے دور سے گزرنا پڑا اور باطل پرست طاقتوں اور صبر آزما مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا، عموماً ہر دین کو اپنے ابتدائی ظہور کے وقت انہی مراحل و منازل کو طے کرنا پڑتا ہے، مگر اسلام نے بہت جلد تمام کٹھن مشکلات کو عبور کر لیا اور سنگلاخ راہوں کو ہموار کرتا ہوا اس مقام پر پہنچ گیا جہاں اس کے سامنے کوئی رکاوٹ اور آڑ نہ تھی۔

دین کی نشر و اشاعت طبعی سیالات یا سیلان پذیر اشیاء کے پھیلاؤ کے بہت مشابہ ہے، یہ انتشار نتیجہ ہوتا ہے دو موثرات کا، ایک موثر داخلی جو مُدافعانہ ہے، دوسرا موثر خارجی جسے جارحانہ سے نامزد کر سکتے ہیں، موثر داخلی مخفی ہوتا ہے، اس کا اثر ظاہر و نمایاں نہیں ہوتا کیوں کہ جسم کو جو جملہ حرارت پہونچتی ہے وہ اس کو حاصل کر لیتا ہے، اس کا عمل یہ ہے کہ عناصر کا مقابلہ کر کے ان پر غالب آجائے، جس وقت عناصر و اجزاء بدن تحلیل پذیر ہو جاتے ہیں تو ان پر موثر خارجی اثر کرتا ہے، جسم کی کمیت و مقدار کی کمی بیشی کے ساتھ رطوباتِ بدن میں انتشار پیدا کرتا ہے جس کو تبخیر کہتے ہیں، اسلام کو انتشار پیدا کرنے کے لیے اس امر کی حاجت ہے کہ موجودہ عادات و رسوم پر غلبہ حاصل کر لے یہی وہ سب سے بڑی دشواری اور رکاوٹ ہے جس سے ہر نئے دین اور ہر نئی تحریک کو دوچار ہونا پڑتا ہے، لیکن اس قسم کا غلبہ عرب کی طبیعت کے لیے نہایت ہی گراں اور شاق تھا، کیونکہ باشندگانِ عرب اپنے عادات و معتقدات کے سخت پابند تھے اور قبائل کے قدیم رسوم ان کی روح کا ایک جزو بن چکے تھے، ان کے لیے ایک ایسے دین میں داخل ہو جانا

نہایت ہی مشکل تھا جس کو اُن کے آباء و اجداد ناپاک تصور کرتے تھے، سب سے بڑی رکاوٹ جو اسلام کے خلاف عربوں کی سرکشی و مخالفت کو تقویت پہونچاتی تھی یہ تھی کہ اسلام تمام انسانوں کو خدائے واحد اور معبودِ یگانہ کے آگے سرِ تسلیم و اطاعت خم کرنے کی دعوت دیتا ہے، اس نظریۂ الٰہی کا قبول کرنا کہ تمام انسان خدائے واحد کے مقابلہ میں باہم مساوی ہیں عربوں پر گراں گزرتا تھا، نیز اسلام اُن کے جاہلی عادات و رسوم اور معتقداتِ باطلہ کا سخت مخالف تھا، یہ لوگ آسانی سے اس قسم کے دین کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے، یہی وجہ ہے کہ اسلام ۶۲۳ء تک جو آنحضرتؐ کی وفات کا زمانہ ہے، ہنوز جزیرۃ العرب کے حدود میں نہ پہونچا تھا، لیکن مسلمانوں کے پہلے گروہ میں ایسے مردان کار تھے جن کی فضیلت و برتری کا پوپ بونفلے معترف ہے چنانچہ وہ کہتا ہے :-

"جو لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لائے تھے، وہ راستباز، ذی ہوش اور ذکی الطبع تھے، منجملہ اُن کے ابوبکرؓ و عمرؓ ہیں، جنھوں نے بہت بڑی وسیع مملکت کی زمام اپنے ہاتھ لی اور سیاست و مملکت کے امور بحسن و خوبی انجام دیئے، یہ ثبات و استقلال، علم و فضل عدالت و قناعت اور بلند ہمت و ارادہ کے مالک تھے، اُن کا مقام ارفع اور اُن کی ہمتیں

اُن بادشاہوں اور حکومتوں سے بلند تھیں جنہوں
نے اُن کے ساتھ جنگ کی تھی۔"

عجیب چیز یہ ہے کہ اسلام کو اپنی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بُت پرست عربوں کی طرف سے پیش آئی اور مقابلہ بھی انہی سے کرنا پڑا، جیسا کہ گذر چکا ہے عرب اپنے دیرینہ رسوم و عادات اور قدیم آبائی معتقدات و افکار کے پابند تھے اور ان کی حریت پسند طبیعت اور استقلال پرست مزاج اُن امور کا کھلم کھلا مقابلہ کرتا تھا، یہ تمام قبائل پراگندہ، صحرا نورد، خانہ بدوش تھے، یہ نہ کسی حکومت و سیاست سے واقف تھے اور نہ کسی تمدن و تہذیب کے دستور سے باخبر، یہ صرف اپنی چراگاہوں میں چرواہوں اور ساربانوں کی حکمرانی سے آگاہ تھے، اُن کے مابین ہمیشہ نبرد آزمائی کا سلسلہ جاری تھا، اس قسم کے جفا خو و درشت طبع قبائل سے ایک نئی اُمت کو تشکیل دینا پیغمبر اسلام کے مقابل ایک کٹھن مرحلہ تھا، اگر دین جدید کی قوت نہ ہوتی جو اُن کی مختلف وحدتوں کو ایک ہی وحدت میں مربوط کئے ہوئے تھی تو یہ وحدت کچھ پائدار نہ ہوتی، جیسا کہ دورِ انتشار و انقسام میں یہ وحدت پارہ پارہ ہوگئی، اور اپنے مرکز دین سے برگشتہ، لیکن بعض قبائل پراگندگی و تفرقہ پذیری کے بعد بھی دین جدید کے پابند تھے اور عربی نام و نشان کو معمورۂ عالم کے اطراف و اکناف دیگر ناموں اور نشانوں کے مابین اوّلین مقام حاصل تھا، ہر شخص خود کو جزیرۃ العرب کے کسی گروہ کی طرف منسوب کرتا تھا بالخصوص یہ نسبت قبیلۂ قریش کی طرف ہوتی، جس کو حسب و نسب

میں امتیاز اور فضیلت و شرف میں برتری حاصل تھی، یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں عربوں کا نام بہت سے امور پر بولا جاتا ہے، مثلاً مورخین کہتے ہیں کہ فلاں گروہ عربی ہے، یا فلاں قوم عربی ہے اور فلاں تمدن عربی ہے حالانکہ اُن کے اور بلادِ عرب کے مابین بجز اسلام کے اور کوئی چیز محیط و جامع نہیں ہے،

عرب قبیلے خونریزی کے بغیر متحد نہ ہوئے، داخلی جنگیں واقع ہوئیں، جو قدیم دشمنی کی چنگاریوں کو بھڑکایا کرتی اور جنگجو فریقوں پر بھاری نقصانات عائد کرتی تھیں، پیغمبرِ اسلام نے بے انتہا جد و جہد کی کہ تمام عرب کو مطیع کرلیں، کیونکہ آپ کی نبوت کی شان کا اُن کے درمیان مظاہرہ ہو چکا تھا، یعنی آپ قوم عرب کے ایک فرد تھے جو نبی بن کر مبعوث ہوئے، آفتاب اسلام بلادِ عرب کے اُفق سے طلوع ہوا اور اپنی نورانی کرنیں اقصائے عالم پر ڈالتا رہا، باشندگانِ عرب ایک سے زیادہ مرتبہ آپ کی زبان سے یہ صدا سنتے تھے کہ "عربوں کے درمیان ہرگز کسی وقت دو دین کا اجتماع نہیں ہونا چاہیئے" اِس لیے دشمن قبیلوں کے حق میں یہ آیات نازل ہوئیں جن سے غضب الٰہی کی تہدید کی گئی ہے۔

یا ایها النبی جاهد الکفار والمنافقین واغلظ علیهم ومأوٰهم جهنم وبئس المصیر ۝ (التوبہ)	اے نبی کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور اُن پر سختی کیجیئے۔ اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بُرا جگہ ہے۔

پھر یہ ارشاد ہوا:-

یا ایہا الذین آمنوا قاتلوا الذین یلونکم من الکفار ولیجدوا فیکم غلظۃ واعلموا ان اللہ مع المتقین (التوبہ)	اے ایمان والو! ان کفار سے لڑو جو تمہارے آس پاس ہیں، ان کو تمہارے اندر سختی پانا چاہیئے، اور یہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ متقی لوگوں کے ساتھ ہے۔
فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منا بعد و اما فداء حتی تضع الحرب اوزارھا (محمد)	پس جب تم کفار سے مقابلہ کرو تو گردنیں مارنا ہے یہاں تک کہ جب تم ان کو خوب قتل کر چکو تو کس کس کے مشکیں باندھ لو پھر اس کے بعد یا تو احسان کرنا ہے یا فدیہ لینا جب تک کہ لڑائی اپنے ہتھیار نہ ڈال دے۔

بعض اشخاص ان آیات و امثال کو مدنظر رکھ کر پیغمبر اسلام پر یہ تہمت تراشتے ہیں کہ کیا آپ پر یہ واجب نہ تھا کہ ان دشمنِ دین، بت پرستوں کے ساتھ آلات و اسلحہ کی قوت کے ذریعہ جنگ کرتے تاکہ بت پرستی ہمیشہ کے لیے بلادِ عرب سے دور ہو جاتی، جیسا کہ اسی بت پرستی نے مذہب توحید کو جو اسلام سے قبل حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا مذہب تھا، جزیرۂ عرب سے زائل کر دیا؟ نیز کیا آپ کا یہ فریضہ نہ تھا کہ دشمنوں اور بت پرستوں کے مابین ایک

ایسی حد مقرر کر دیتے کہ وہ دوبارہ بت پرستی کی طرف رجوع نہ کرے۔

وقاتلوا ھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ

(الانفال)

اور تم اُن سے اس حد تک لڑو کہ اُن میں فساد عقیدہ نہ رہے اور دین اللہ ہی کا ہو جائے۔

جمیع مفسرین قرآن نے ہمیشہ بت پرستوں اور باقی کفار کے درمیان فرق کیا ہے، مجوس (آتش پرست) بقول ابراہیم خلیل بت پرست ہیں، جن کے دین کو مسلمان یہود و نصاریٰ کے دین کی طرح قبول نہیں کرتے، حتیٰ کہ جزیہ دینے پر بھی اُن کو مسلمانوں کے ملکوں میں قیام پذیری کا حق نہیں دیتے، کیونکہ اُن سے جزیہ قبول نہیں ہوتا، اُن کو تین دن کی مہلت دی جاتی ہے اُن میں یا تو وہ ہجرت کر جائیں، یا دینِ اسلام قبول کر لیں یا مرنے کے لیے تیار رہیں۔ توریت کی پانچویں کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بت پرستوں کے معاملہ میں سختی کا برتاؤ کرنے کا حکم ہوا ہے اور کہا گیا ہے کہ

"جس وقت خدا تجھے اِن بت پرستوں کے ملک کا حکمران بنا دے، خدا... تو بہت سی قوموں کو ہلاکت کے گھاٹ اُتار چکا ہے، تو اُن کے ساتھ جنگ کر یہاں تک کہ یہ تمام بت پرست ہلاک ہو جائیں۔ اُن کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ کر اور ہرگز کبھی اُن پر رحم نہ کھا۔"

اسی طرح خدا نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ بت پرستوں کے شہروں کو تباہ و برباد کر ڈالیں اور اُن پر کسی طرح رحم نہ کھائیں، اور دور دراز شہروں میں بسنے والے بت پرستوں کو جہاں اُن کی رسائی ناممکن ہے درگزر کر دیں۔ یہی حکم آنحضرت کو بھی دیا گیا، چنانچہ آپ کے دل میں اعتقاد و یقین کی یہ شدت و قوت موجزن تھی کہ قرآن آپ پر نازل ہوا ہے تاکہ آپ اُس کے ذریعہ انسانوں کو کفر کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان کی نورانی سرحدوں میں داخل کریں، اسی شدتِ اعتقاد اور قوت یقین نے آپ کو جنگ کے لیے آمادہ کیا، لہٰذا آپ حضرت اشعیا کی طرح بت پرستوں کو ہلاک و برباد کرنے میں اپنے خدا کی خدمت تصور کرتے تھے، نیز ابتدائے امر میں بعض قبائل کا اسلام لانا بے شمار ارتدادوں کا موجب بن گیا، کیونکہ اس کی وجہ سے فتنہ کی آگ تمام بلادِ عرب میں مشتعل ہو گئی، یہ امر پیغمبر کی مصلحت کے تقاضے کے سراسر خلاف تھا کہ ان مرتدین سے صلح کر لی جاتی، اور باطل کو حق پر غلبہ پانے دیا جاتا:

پوپ آگستان کی ایذا رسانی

پوپ آگستان نے جس کا زمانہ ہمارے دور سے دور نہیں ہے اپنی طرف سے ایک مشہور دستاویز کاؤنٹ بونیفاس کو لکھی، وہ اس دستاویز میں اشارہ کرتا ہے کہ جدت طراز عیسائیوں کو مسیحیت کی طرف دوبارہ واپس لانے کے لیے قوت کو کام میں لانا ضروری ہے، اس دستاویز میں پوپ جدت طرازوں اور مرتدین کو خچروں سے تشبیہ دیتا ہے جو لوگ ان خچروں کا علاج کرنا چاہتے ہیں اُن کو ایذا پہنچاتے ہیں، خچروں کے

زخموں پر ترس کھانے کے لیے اُن کو لامحالہ زدوکوب کرنی پڑتی ہے چھوٹے بچوں کی تربیت تازیانہ اور جسمانی ایذا رسانی ہی سے ممکن ہے، اسی طرح جو اذیت و آزار اشرار کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے وہ اُن کو نیکی کے راستہ پر واپس لانے کے لیے اُن کے حق میں عظیم الشان احسان ہے؛ اس میں شک نہیں کہ بھلائی اور تعلیم کے ذریعہ انسانوں کو طاعت الٰہی کے دائرہ میں لے آنا زجر و توبیخ، ایذا رسانی اور سختی و درشتگی استعمال کرنے کی بہ نسبت بدرجہا بہتر ہے، مگر یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ انسان دو قسم کے ہیں، ایک گروہ ایسا ہے جس کو بحث و مباحثہ سے بآسانی خاموش کیا جا سکتا اور راہِ حق کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے، ایک طبقہ کُند فہم اور مخالف و سرکش ہوتا ہے۔

مشاہدات و تجربات ہمیں یہ سبق دے چکے ہیں اور ہمیشہ یہ درس دے رہے ہیں کہ بعض اشخاص کو تحصیلِ علم پر آمادہ کرنے یا اپنے عقائد و افکار اور معلومات کے مطابق جو اُن کو حاصل ہو چکے ہیں، عمل کرنے کی ترغیب دینے کے لیے زجر و توبیخ اور تخویف بہترین اوزار ہے، اس کے بعد دستاویز نویس اپنے فلسفۂ آزار کی تشریح اس انداز میں شروع کرتا ہے کہ اذیت و آزار ایک طرح سے عین عدل و انصاف ہے اور ایک حیثیت سے ظلم، اگر نیکوکار اور پرہیزگار لوگ بدکاروں اور شرپسندوں کے خلاف تشدد آمیز طریقے اور ظالمانہ افعال استعمال کریں تو انصاف ہو اور اگر بدکار نیکوکاروں کے خلاف یہ مظاہرہ کریں تو وہ ظلم ہوگا چنانچہ وہ

کہتا ہے:۔

"کلیسا جس کو چاہے تکلیف و اذیت دے، اشرار بھی جن سے نفرت رکھتے ہیں، ان کو ایذا پہونچائیں، کلیسا اتحاد و یکجہتی پیدا کرنا چاہتا ہے، اشرار، انتشار اور تفرقہ اندازی کی تمنا رکھتے ہیں، کلیسا لوگوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے کام کرتا ہے، اشرار ضلالت و گمراہی کی وادیوں کی طرف دوڑتے ہیں۔"

ظہورِ اسلام کے آغاز میں لوگوں کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ بآسانی اسلام لے آئیں اور بلا کسی مزاحمت کے اسلام کو سمجھ لیں، کیونکہ جو اسلامی حرارت پیغمبرِ اسلام اور صحابۂ اوّل کے دلوں میں موج زن تھی وہ عربوں کی درشت خو طبیعت کے مخالف تھی، لیکن جب عرب حلقہ بگوشِ اطاعت ہو گئے، قرآن پر ایمان لائے اور ان کے دل دینِ اسلام کے نور سے منور ہو گئے تو وہ تمام دنیا والوں کے روبرو ایک نئے رنگ اور جداگانہ روپ میں جلوہ گر ہوئے یعنی انھوں نے مصالحت کا طریقہ امن پسندانہ مسلک اور آزادیٔ عقاید کی روش اختیار کی، سرکش اور مرتد قبیلوں کی زجر و توبیخ اور انذار و تخویف کی آیتوں کے پے در پے وہ آیتیں نازل ہوئیں جن میں حسنِ سلوک اور خوشگوار روش اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

لا اکراہ فی الدین قد تبین دین میں زبردستی نہیں، ہدایت یقینا

الرشد من الغی۔ (البقرہ)	گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے۔
ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدواً بغیر علم (الانعام)	اور جو لوگ اللہ کے سوا کسی دوسرے کو پکارتے ہیں اُن کو برا بھلا نہ کہو کہ وہ بغیر سمجھے بوجھے بے ادبی سے اللہ کو برا کہیں گے۔
واصبر علی ما یقولون واھجرھم ھجراً جمیلاً (المزمل)	اور یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں، اُن پر صبر کرو اور خوبصورتی کے ساتھ اُن سے الگ ہو جاؤ۔
وعباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھونا واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاماً (الفرقان)	اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں، اور جب اُن سے جہالت والے لوگ بات کرتے ہیں تو وہ رفع شر کی بات کہتے ہیں۔

یہ تھیں پیغمبر اسلام کی تعلیمات جن کا مظاہرہ عربوں نے اسلام لانے کے بعد کیا، آپ کے بعد آپ کے خلفاء نے آپ کی پیروی کی، یہ ترتیب وار حقائق رابن سن کے حسب ذیل بیان میں اُجاگر ہوتے ہیں، وہ کہتا ہے کہ:۔

"پیروانِ محمد صرف وہی اشخاص ہیں جنھوں نے
حسن سلوک اور دین کی نشر و اشاعت کی محبت کو

یکجا کر دیا ہے، اس تبلیغ دین کی محبت نے فتوحات کے ذریعہ اُن کو دُنیا میں آشکارا کر دیا، اس میں کوئی عیب اور نقص نہ ہوگا اگر ترویج دین کی محبت فتوحات کا سبب و مقصد بن جائے، جس وقت اسلامی فوجیں شام پر حملہ آور ہوئیں اور یہاں سے بجلی اور آندھی کی مانند شمالی افریقہ تک اور بحر احمر سے بحیرہ اٹلانٹک تک چلی گئیں، قرآن اُن فاتح فوجوں کے پیچھے اپنے نورانی بازو پھیلائے ہوئے تھا، کسی قسم کے ظلم و ستم کا اثر بجز اس انداز سے کے جو ہر جنگ و قتال کا لازمہ ہے، لشکر اسلام کی راہ میں نہ تھا، جو قومیں اسلام قبول نہ کرتی تھیں مسلمان اُن کو قتل نہیں کر دیتے تھے، اگر بربر اور مسلمانوں کے حملہ کے مابین جو بعد میں وقوع پذیر ہوا مقابلہ کر کے دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ مسلمانوں کے حملہ میں ضرر و نقصان کم اور فائدہ زیادہ تھا، مسلمان جن قوموں سے مڈبھیڑ ہوتے، اُن کو سب سے پہلے اِن تین اُمور میں سے کسی ایک کا اختیار دیتے، اسلام یا جزیہ یا جنگ، جس وقت ابوبکر صدیق رضؓ نے خالد بن ولید کو شام کی طرف روانہ کیا،

اپنی احکام دا دا مرگو زادو راہ قرار دیا۔ یہ فرمودات
و احکام بجز بت پرستوں کے تمام کافروں پر جاری
تھے، اس کی وجہ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، اُن کے
ساتھ سلوک اوروں کے سلوک سے جُداگانہ تھا؛

یہاں ایک امر کا اظہار خالی از دلچسپی نہ ہوگا وہ یہ کہ حضرت ابوبکرؓ کے اوامر کا موازنہ توریت کی کتاب پنجم کی تعلیمات سے کیا جائے کہ مداین کے محاصرہ اور کلدانیوں کے ساتھ سلوک کے متعلق کیا کہتی ہیں :-

"جس وقت تو کسی شہر کے قریب پہنچ جائے،
محاصرہ کرنے کے بعد اُس شہر کے باشندوں کے
سامنے امان کا اظہار کر، اگر وہ قبول کریں تو صحیح
سلامت رہیں گے اگر قبول نہ کریں اور دشمنی پر کمربستہ
ہو جائیں تو محاصرہ ان پر تنگ کر دے اور جب خدا تجھے
اُن پر غلبہ کی توفیق عطا کرے تو شہر کے ہر مرد اور
لڑکے کا سر تلوار کی دھار سے اڑا دے۔"

مشرق میں اسلام کی اشاعت اور اس کی رواداراںہ روش۔

مسلمانوں نے ایشیا اور افریقہ کا جب رخ کیا تو یہاں کے عیسائیوں نے صرف ہلکا سا مقابلہ کیا، اس کے بعد دین اسلام میں وہ داخل ہو گئے، ظاہر ہے کہ اسلامی تسلط واقتدار کے دور میں کلیساؤں کی وہ شان و شوکت نہ رہی جو قبل

از اسلام قرطاجنہ جیسے کلیساؤں کو حاصل تھی، عیسائی مورخین زمانہ سے کلیسا کے انحطاط سقوط و زوال کا سبب نصاریٰ کے ساتھ مسلمانوں کے ظلم و تعصب اور ان کی بدسلوکی کو قرار دیتے ہیں، جو مولفین اسلامی فتوحات کے دور میں گزرے ہیں کلیساؤں کے سقوط کے سبب کو اپنے زمانے کے احوال و ظروف کے مناسب ذکر کرتے ہیں، اسلام کے ارتقا اور تیز رفتاری کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ مسیحیین غضب الٰہی کے مستحق ہوئے تھے، چونکہ یہ راہ حق سے بیروں و برگشتہ ہو گئے ہیں اس لیے خدا نے چاہا کہ ان پر قہر و عتاب نازل کرے، بعض شہادت گذاروں نے چاہا کہ اس دلیل کو محکم کریں اور لوگوں کو توبہ کی طرف متوجہ کریں اس لیے انہوں نے عیسائیوں کی گمراہی کے باب میں مبالغہ کیا اور ان کو مورد ملامت ٹھہرایا اور کہا کہ اسلامی فوجیں آسمانی اسباب ہیں جن کے ذریعہ خدا نے نصاریٰ سے انتقام لینا چاہا ہے، اس بیان و توضیح کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی فتح ایشیاء اور افریقہ میں مسیحی کلیساؤں کے مابین تفرقہ پردازیوں کا نتیجہ ہے اس لحاظ سے جو مورخین ان دونوں واقعات کو جمع کیے ہوئے ہیں، ان پر کوئی ملامت نہیں کی جاتی، حتیٰ کہ فاتحین بھی غیر قوموں کے اسلام لانے اور قوت قاہرہ پیدا ہو جانے کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے، ان کی اس غلطی کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ وہ اسلامی فتح کو عیسائیوں کے تفرقہ اور ان کے مسلمان ہونے کا سبب جانتے ہیں، ان دونوں صورتوں میں سے ہر ایک صورت ایک طرح سے ایک دوسرے پر اثر انداز ہو چکی ہے، کیوں کہ جس طرح اسلامی فتح نے عیسائیوں کو ترک مذہب کے ذریعہ عالم آشکارا کیا اسی طرح نصاریٰ کے مابین جو تفرقہ تھا اس نے مسلمانوں کی

فتح کو سہل کر دیا۔

آریوس نے الوہیت عیسیٰؑ کا انکار کر دیا، اس لحاظ سے وہ پیغمبر اسلام کا ہراول تھا، کیوں کہ اس نے اسلام کا راستہ یہ کہہ کر کھول دیا کہ اسلام حضرت مسیحؑ کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہتا کہ مسیحؑ حضرت محمدؐ سے قبل تمام پیغمبروں سے آخر تھے، ظہور اسلام کے بعد کوئی شخص پیدا نہ ہوا جو مذہب تثلیث کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نکالے، بلکہ پیروانِ مسیحؑ مسلسل بارہ سو سال تک بالاجماع اس مذہب کے پابند تھے، اور یہ مذہب عام عیسائیوں کا مذہب بن چکا تھا، اربابِ بحث و تحقیق کو، جو مذہب تثلیث کا عقیدہ نہ رکھتے تھے، اتنی جرأت نہ ہوتی تھی کہ اس مذہب کو اس لحاظ سے کہ یہ ذاتِ الٰہ کے تعدد کو مستلزم ہے توحید کو ماننے والے ادیان سے خارج کر دیں، اس لحاظ سے دینِ مسیح کے مقابلہ میں اسکندریہ کے پوپ آریوس کا ظہور خوارق عادات میں سے تھا، یہاں تک کہ آریوس کے اس دعویٰ کی وجہ سے ارکانِ دینِ مسیح پر لرزہ طاری ہو گیا اور مجلس مسیحیوں کے دلوں پر یاس و ہراس مسلط ہو گیا اور جنیروم مقدس آہ کھینچتا اور کہتا تھا، چونکہ لوگ کافر ہو گئے اور بیٹے کے اندر باپ کے تجسم کا اعتقاد نہیں رکھتے اس لیے تمام عالم پر دہشت و حیرت کی حالت طاری ہے، پیروانِ نیس مسیحیوں کو اتنی طاقت حاصل ہے کہ وہ اس نئے دین پر غلبہ پالیں لیکن اس کے باوجود اس اختلاف کی وجہ سے افریقہ و ایشیا کے کلیساؤں میں ایک شگاف پیدا ہو گیا اور اسلام نہایت تیزی و سرعت کے ساتھ ظہور پذیر ہو گیا، ان طبقات نے جو باہم جنگ و جدل اور بحث و مباحثہ میں الجھے ہوئے تھے اسلام کو

دینِ جدید کے عنوان سے حاصل نہ کیا بلکہ اُس کو مسیحی مذہب کا ایک موضوع قرار دے کر قبول کر لیا۔

ایشیاء و افریقہ کے دو بڑا عظموں کی سلطنت کے مقابلہ میں اسلام کا پھیلنا اور یہاں کی قوموں پر غلبہ پانے کا ایک اور سبب بھی ہے اور وہ سبب دولت قسطنطنیہ کا ظلم و استبداد ہے، کیونکہ اس سلطنت کا ظلم و جور درجہ انتہا کو پہونچ چکا تھا، ظالم حاکموں نے انسانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا، جس وقت اسلام اُن ملکوں میں داخل ہوا تو لوگ بے حساب جرمانوں سے، جو اُن پر عائد کیے گئے تھے، تنگ آکر اور اپنے مال و جائداد سے، جو اُن سے ضبط کر لی گئی تھی، فرار ہو کر خود اسلام کے دامن میں پناہ لینے کے لیے چلے آئے، جو گروہ مسلمان ہو جاتا تھا اُس کے تمام جرمانے معاف کر دیئے جاتے تھے اور جس قدر مال و جائداد اُن کی ضبط کر لی گئی تھی اُن کو واپس مل جاتی تھی، جو شخص بھی قرآنی شریعت کا قائل نہ تھا، اُس کے ساتھ بغیر کسی امتیاز و تفریق کے یہی معاملہ درپیش ہوتا تھا، اور اُس کو صرف جزیہ دینا پڑتا اور یہ جزیہ بھی نہایت حقیر رقم پر منحصر ہوتا (یعنی دس درہم میں ایک درہم یا بارہ میں ایک درہم) اس طرح جزیہ ادا کر کے یہ مظلوم دینِ جدید کے سایہ میں امن و امان سے زندگی گذارتے تھے، مبلغین اسلام میں سے کوئی مبلغ یا خلیفہ اُن کے دین کی راہ میں حائل نہ ہوتا، خواہ کوئی شخص مسیحی مذہب پر باقی رہا ہو یا اس سے خارج ہو جائے اِن دونوں کے درمیان کوئی تفریق نہ تھی، یہی وہ دستور و اصول ہے جس کو قرآن نے مقرر فرمایا خلفاء راشدین اِس دستور اور طریقۂ قرآنی کے پیرو تھے، اس لحاظ سے یہود و نصاریٰ کو اسلامی

شریعت کی اصطلاح میں ذمّی کہتے ہیں، اُن کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) ذمّی (۲) مستامن (پناہ گزیں)

(۳) محارب (جنگجو)

ذمّی وہ شخص ہے جو مسلمانوں کے ملکوں میں سکونت گزیں ہے اور حکومت اسلامی کے احکام کا مطیع اور باج گزار ہے، یہ شخص اپنے مذہبی رسوم کے مطابق خدا کی عبادت کرتا ہے، امن عامہ اور حکومتی قوانین کے تابع ہے؛ اپنے شخصی حالات مثلاً نکاح، طلاق، ورثہ وغیرہ میں اپنے مذہبی مقتضیات کے موافق عمل کرتا ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اس امر کا معترف ہو کہ دین اسلام کے مطابق اس کے ساتھ سلوک و عمل ہوتا ہے، یہ بہت بڑی غلطی ہوگی اگر ہم لفظ ذمّی کو پست اور حقیر معنی میں استعمال کریں کیونکہ ذمّی کے حقیقی معنی ایک ایسے شخص کے ہیں جو اسلام کی پناہ میں آجائے؛

مستامن (پناہ گزیں) ایک ایسا اجنبی شخص ہے جو مسافر ہو اور بین الاقوامی قوانین و معاہدات کے زیر رعایت زندگی بسر کرتا ہو۔

محارب (جنگجو) وہ شخص ہے جو ایسے ملکوں میں بستا ہو جن کا شعار اسلام کے ساتھ کھلم کھلا دشمنی ہے یا وہ مسلمانوں کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں رکھتے، جس کے ذریعے سے وہ مسلمانوں کے ملکوں میں امن و امان میں رہ سکیں، اگر کوئی جنگجو اسلامی ممالک میں کسی مسلمان کے روبرو تلوار کھینچ لے تو اسے یا تو جزیہ دینا پڑے گا یا اس کا انجام موت ہوگی، اگر تمام کے تمام جزیہ دیں تو امان میں ہوں گے؛

حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ جزیہ صرف اس لئے مقرر ہوا ہے کہ اس کے ذریعہ ذمی کا مال اور اس کی جان مسلمان کی جان و مال کے برابر ہو جائے، یہی وہ صلح جویانہ طریقہ اور روادارانہ روش تھی جو اسلامی ارتقاء اور فاتحین کی پیش قدمی کا موجب ہوئی کیونکہ مسیحی مشرقی مملکت کے سلاطین کے ظلم و استبداد کی وجہ سے جس کے لوگ دشمن تھے اور اپنی زندگی سے تنگ آچکے تھے، اسلام کی تیز رفتاری میں اضافہ ہو گیا۔

اگر ہم اسلامی فتوحات کے ابتدائی دور سے اسلامی حکومت کے استقرار و استقلال تک کے عہد تک نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ مشرقی مسیحیوں کے ساتھ اسلام کا سلوک نہایت بہتر اور روادارانہ تھا، عربوں نے کسی وقت بھی مسیحی مذہب کے شعائر و معتقدات سے تعارض نہ کیا، بلکہ ان کو اپنے پادریوں کے ساتھ جو اپنی قدیم حالت پر باقی تھے، مراسلت کی پوری طرح آزادی حاصل تھی، سنہ ۱۰۵۲ء میں پوپ لیون نہم نے افریقہ کے عیسائیوں کے نام ایک خط لکھا جس میں وہ وصیت کرتا ہے کہ قرطاجنہ کے پوپ کو اپنے درمیان عام مقتدر جانیں، نیز مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تعلقات و روابط اس حد تک مستحکم تھے، کہ گری گرے ہفتم نے عیسائیوں کے نام ایک خط لکھا اور ان کو ملامت کرتا ہے کہ انہوں نے اپنے پوپ کے ساتھ مسلمانوں کے نزدیک محاکمہ کیا ہے، یہ واقعہ ۵ ستمبر سنہ ۱۰۷۶ء میں پیش ہوا، اس مفاہمت و مصالحت میں جو غالب قوم کی طرف سے مغلوب قوموں کے حق میں واقع ہوتی تھی مسیحی مذہب بے انتہا کمزور ہو گیا، یہاں تک کہ وہ

بالکلیہ شمالی افریقہ سے باہر ہو گیا، حالانکہ اسلام مسیحی مذہب کی مانند مخصوص مبلغین نہیں رکھتا تھا جن کا مشغلہ دین اسلام کی دعوت اور مبادی اسلام کی تعلیم ہو، اگر اسلام بھی اپنے لیے خاص مبلغین فراہم کرتا تو اسلام کی سرعت رفتار اور اس کی پیش قدمی کے سبب کا سمجھنا ہمارے لیے سہل تھا، کیونکہ ہم شاہ شارلمان کو دیکھتے ہیں کہ جنگوں میں ہمیشہ پادریوں اور راہبوں کی ایک جماعت اپنے ہمراہ رکھتا تھا، تاکہ جب کبھی وہ اپنے لشکر جرار کے ساتھ سخت معرکہ آرائیوں کی بدولت جو جوانوں کو بھی بوڑھا کر دیتی تھیں، شہروں اور ملکوں کو فتح کرلے تو پادری اور رہبان لوگوں کے قلوب فتح کرنے میں مشغول رہیں، لیکن ہمیں اسلام کے لیے نہ تو کسی دینی جماعت کا سراغ ملتا ہے، نہ فوجوں کے پشت پر داعیوں اور مبلغین کا نشان اور نہ ہی فتح کے بعد کسی راہب کا وجود، پس اسلام نے نہ تو شمشیر سے اور نہ ہی زبان سے کسی پر زبردستی کی ہے بلکہ اسلام اختیار اور شوق کے جذبات کے ذریعہ دلوں میں داخل ہوا ہے اور یہ نتیجہ ہے دلوں کی اس تاثیر اور جذب کا جو قرآن میں موجود ہے بے شک ایک جماعت طلب منفعت کی خاطر اسلام میں داخل ہوئی لیکن یہ جماعت ان اشخاص کے مقابلہ میں جو اسلام کے صحیح میلان اور اعتقاد صادق کی رو سے اسلام لائے بہت ہی کمیاب تھی، کسی شخص کا دین اسلام کی سادگی اور کلمۂ توحید کی عظمت و شان کو دیکھ کر اس غرض سے اسلام لانا کہ وہ مسلمانوں میں سے شمار ہو نہایت آسان کام تھا، اس کے باوجود حکومت اسلامی کے استقرار اور اس کے

انتظامی امور کے استحکام کے بعد سے ہمیں یہ پتہ نہیں ملتا کہ کسی مسیحی جمعیت نے اپنے دین کو ایک دفعہ بھی ترک کر دیا ہو، بلکہ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص مسلمان ہونا چاہتا اس کے لیے یہ ضروری ہوتا کہ اس کا اسلام قاضی کے روبرو تحریری وثیقہ کے ذریعہ ثابت ہو، جس میں اس کا ذکر کیا جائے کہ مسیحی نے از روئے اعتقاد بدوں خوف و اکراہ دین اسلام کو قبول کیا ہے اس قدر احتیاط کی وجہ یہ تھی کہ کسی شخص کے لیے یہ روا نہیں کہ طوعاً و کرہاً اپنے دین کو تبدیل کر دے[1]۔

عہد بنی امیہ میں مصر میں اسلام کا داخلہ

دولت بنی امیہ کے زمانے میں عیسائیوں کا داخلہ دین اسلام میں پیہم بڑھتا گیا، یہاں تک کہ مسلم حکام ان کے مسلمان ہونے سے خوش نہ تھے، اس لیے کہ ان کے اسلام لانے کی وجہ سے بیت المال میں نقصان ہوتا تھا۔

معاویہ رضؓ کے عہد خلافت میں مصر کے مالیات حضرت عثمان رضؓ کے دور خلافت کے مالیات سے نصف حد تک پہونچ گئے، اس کا سبب یہ تھا کہ بے شمار قبطی اسلام میں داخل ہو گئے، بنا بریں مسلم حاکموں نے ان پر دین اسلام میں داخلہ کی راہ تنگ کر دی، جو لوگ اسلام لانے کی تمنا و رغبت

---

[1] اس قسم کی کارروائی شرعاً واجب نہیں ہے، شاید مؤلف نے یہ مفہوم اس زمانے کے قاعدہ و دستور کے مطابق اخذ کر لیا ہو۔ (مترجم عربی)

رکھتے تھے اُن سے جزیہ معاف نہیں کیا جاتا تھا، اس کی دلیل میں وہ خط پیش کیا جاتا ہے جسے حیان نے حضرت عمر بن عبدالعزیز، جو تمام خلفاء بنی امیہ میں متقی اور خدا ترس خلیفہ تھے اور جو عمر ثانی سے مشہور ہیں، کے نام لکھا تھا، جس میں وہ لکھتے ہیں:۔

"اگر مصر میں موجودہ صورت حال باقی رہی تو ملک کے تمام مسیحی مسلمان ہو جائیں گے، اور خلافت کو جو اُن سے ٹیکس (جزیہ) وصول کر رہی ہے، نقصان اور خسارہ اُٹھانا پڑیگا۔"

خلیفہ نے جب یہ خط پڑھا تو اسی وقت ایک قاصد حیان کے پاس روانہ کیا اور اس کو یہ تاکید کی کہ:۔

"جس وقت تم حیان کے پاس پہونچ جاؤ تو اس خط کے عوض جو اس نے لکھا ہے۔

تیس کوڑے اس کے سر پر مارو اور اس سے کہو کہ جو شخص اسلام اختیار کرلے اس سے جزیہ ساقط ہو جاتا ہے، اس لیے کہ میں اسی میں اپنی خوش بختی و سعادت تصور کرتا ہوں کہ تمام عیسائی مسلمان ہو جائیں، کیونکہ خدا نے اپنے پیغمبر کو اس لیے بھیجا کہ اپنا پیغام پہونچا دیں، نہ اس لیے کہ مالیات و

اموال جمع کریں "

مسلمانوں کا یہ اندیشہ کہ غیر اقوام کے اسلام قبول کر لینے سے بیت المال کے سرمایہ میں کمی واقع ہو جائے گی ہمارے نزدیک کوئی تعجب خیز نہیں کیونکہ الجزائر میں مالیات مسلمانوں کے ذمہ ہیں، اُن سے جو مالیات وصول ہوتے ہیں وہ عیسائیوں سے حاصل کئے ہوئے مالیات سے زیادہ مقدار میں ہوتے ہیں، اِس لحاظ سے اگر الجزائر کے مسلمان عیسائی ہو جائیں اور اُن کو وہ تمام امتیازات وحقوق جو عیسائیوں کو حاصل ہیں، عطا کر دیئے جائیں تو ہم سرمایہ کی قلت کی وجہ سے سخت حیرت میں پڑ جائیں گے "

اُندلس میں اسلام بلادِ اندلس میں عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کی رواداری اور حسنِ سلوک کا یہ عالم تھا کہ اِس مبارک دور میں عیسائیوں کی حالت اُس زمانے کی بہ نسبت بہتر ہو گئی جب کہ یہ قدیم جرمنوں کی حکومت کے زیر سایہ جن کو خو بخود سے نامزد کرتے ہیں، زندگی گزار رہے تھے، ڈوزی کہتا ہے کہ مسلمانوں کے اندلس کو فتح کرنے کی وجہ سے اندلس کو کوئی ضرر و نقصان نہ پہونچا، فتح کے بعد اندلس میں جو اضطراب و خلفشار اور شکست و ریخت کا جو طوفان بپا تھا اُس نے زیادہ طول نہ کھینچا بلکہ وہ حکومتِ اسلامی کے استحکام کے ذریعہ زائل ہو گیا، مسلمانوں نے باشندگانِ اندلس کو اُن ہی کے دین و شریعت اور قضائی امور پر بحال رکھا، اُن کو اپنی حکومت کے بعض عہدوں پر فائز کیا، یہاں تک کہ اُن کے کچھ آدمی مسلم حاکموں کے دفاتر میں اونچے عہدوں پر مامور تھے، اور بہت سے اشخاص تو فوجوں کے سپہ سالار بنائے گئے جن میں

السڈکمپیڈر کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے، اس رواداراِنہ سیاست کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملت اندلس کا عقلمند اور روشن ضمیر طبقہ مسلمانوں کی جانب مائل ہو گیا، اُن کے ابین شادی بیاہ کا لین دین بڑھ گیا، اہل اندلس کی اکثریت اپنے ہی دین پر باقی رہی، مگر عربی تمدن کی خوبی اُن کے دِل کو بھا گئی انھوں نے عربی زبان واَدب کو شوق و ذوق سے سیکھ لیا، چونکہ انھوں نے کلیسا کی زبان چھوڑ دی اور حاکموں کے آداب و روایات سے تعلق پیدا کر لیا تھا اس لیئے اُن کو اَربابِ کلیسا (مشائخ و رہبان) ملامت کیا کرتے تھے، اندلس میں مذاہب کی آزادی تو اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی، یہی وجہ ہے کہ جس وقت اہلِ یورپ نے یہودیوں کو اذیت و آزار میں مبتلا کر دیا تو اِن لوگوں نے قرطبہ میں خلفاء اندلس کے دامن میں پناہ لی، لیکن جب کارلوس بادشاہ سرقسطہ میں داخل ہوا تو اپنے لشکر کو حکم دیا کہ یہودیوں کے گرجا گھر اور مسلمانوں کی مسجدیں تباہ و مسمار کر دی جائیں، ہم اس تاریخی دردناک واقعہ سے باخبر ہیں کہ صلیبی جنگوں کے زمانے میں عیسائی جس شہر اور جس ملک میں بھی گئے، یہاں کے یہودیوں اور مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا، اِس سے پتہ چلتا ہے کہ یہودیوں کا ملجا و ماویٰ صرف اسلام تھا؛ اِس لحاظ سے یہودیوں میں سے کوئی شخص بھی دامنِ اسلام میں پناہ گزیں رہا تو اُس کی فضیلت کا سہرا مسلمانوں کے حُسن سلوک اور اُن کی رواداری کے سر ہے، اس کی وجہ یہ ہو ہی نہیں سکتی کہ یہود مسلمانوں کے ساتھ اُن کی قومیت، اُن کے دین اور اُن کی زبان میں شریک ہو گئے تھے، جیسا کہ انیدیکور شائکین نے دعویٰ کیا ہے؛

مسلمانوں نے اندلس کے عیسائیوں سے صرف وہی مطالبہ کیا جو اور وں سے کیا کرتے تھے یعنی وہ بھی دوسروں کی طرح جزیہ ادا کریں، یہاں ایک واقعہ کا ذکر، جس کو عرب مورخین نے نقل کیا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ جزیہ کے بارے میں مسلمانوں کے عقائد کیا تھے اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین کس قسم کے روابط و تعلقات تھے، ایک مسیحی شخص فقہائے قرطبہ میں سے ایک فقیہ کا ہمسایہ تھا، جب کبھی یہ عیسائی اس فقیہ کو راستے میں دیکھتا سلام کیا کرتا اور فقیہ اس کو اس طرح جواب دیتا اطال اللہ عمرک (خدا تمہاری عمر دراز کرے) بعض زاہدانِ خشک نے جو زیادہ تر قرآن فہمی کے دعوی دار تھے، فقیہ کی زبان سے یہ الفاظ سن لیے اور یہ دیکھ کر کہ ایک عیسائی کے حق میں فقیہ اس قسم کی دعاء کرتا ہے اس پر ملامت کی، فقیہ اس ملامت کو سن کر چیں بجبیں نہ ہوا بلکہ نہایت طمانیت اور سنجیدگی سے ان کو جواب دیا کہ "میری اس دعا کا مقصد کہ خدا اس عیسائی کی عمر دراز کرے، یہ ہے کہ اسکی عمر بڑھے، وہ باقی رہے اور زیادہ مدت تک جزیہ دیتا رہے۔" ظاہر ہے کہ چونکہ فقیہ کی عیسائی سے دوستی تھی اور وہ ان اشخاص کی ملامت کا غبار اپنے دامن سے جھٹکنا چاہتا تھا اس لیے اس نے ایسا جواب محض ان کو خاموش کرنے کے لیے دیا، عرب مورخین اور اہل اندلس کی حکایات اس قسم کے واقعات سے مملو ہیں، جو ان دونوں قوموں کے مابین کے گہرے تعلقات اور عمیق جذباتِ مودت پر دلالت کرتے ہیں۔

بنابریں ان دو قوموں کے مابین بغض و دشمنی کو اہمیت دینا مبالغہ

مبنی ہے، کیا ہم نہیں دیکھتے ہیں کہ شام و اندلس کے خلفاء اپنے لیے عیسائیوں میں سے ندیم کا انتخاب کیا کرتے تھے، اُن کو بلند مراتب و مقامات عطا کیے جاتے تھے، مسلمان خلفاء کے اِس طرز عمل کی شکایت کرتے تھے اور اِس بدیہی حکمت کو جو پیغمبر اسلام پر نازل ہوئی ہے بار بار دہراتے تھے۔

یا ایہا الذین آمنوا لا تتخذوا الیہود والنصارٰی اولیاء بعضہم اولیاء بعض ومن یتولہم منکم فانہ منہم ان اللہ لا یہدی القوم الظالمین[1] (المائدہ)	اے ایمان لانے والو! یہود و نصارٰی کو دوست نہ بناؤ اُن میں سے ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو تم میں سے ان کو دوست بنائے گا تو وہ انھیں میں سے ہو جائے گا۔ بیشک اللہ ظالمین کی راہنمائی نہیں فرماتا۔

بعض علماء نے عیسائیوں کی دوستی کو حرام قرار دیا ہے، اُن کا قول یہ ہے کہ اُن کو منصب و ولایت عطا کرنا صرف اُس صورت میں جائز ہو سکتا ہے جب کہ اُوامر دینی ضرورت و احتیاج کے ساتھ متفاوت نہ کر سکتے ہوں، اسلام میں عیسائیوں کو جو مناصب اور عہدے عطا کیے گئے وہ اسلامی فتح کے بعد ایک لازمی امر کی حیثیت رکھتے تھے، کیونکہ عرب قوموں کی سیاست سے

---

[1] یہ آیت صرف منع ولایت پر دلالت کرتی ہے، شریعت میں کوئی ایسا قانون نہیں جو عیسائیوں کے ساتھ دوستی کو منع کر دے جیسا کہ اس کا بیان اُوپر ہو چکا ہے۔
(مترجم عربی)

ابھی آشنا نہ ہوئے تھے، ملکوں کا نظم و نسق اور ان کا انتظام ان کے لیئے دشوار گذار کام تھا، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے عیسائیوں کی خدمات حاصل کرنے کو ضروری سمجھا، مگر اونچے عہدوں پر مسیحی ملازمین کا وجود اسلامی وحدت پر ایک کاری ضرب لگاتا تھا، عربوں کا جدید طبقہ ان کو "اسلامی آنکھ کا کانٹا" سے نامزد کرتا ہے، مسلمانوں کو ان سے جو بغض اور دشمنی تھی، اس کا سبب ان کے وہ مظالم تھے جو پیہم ڈھائے جاتے تھے لیکن یہ عداوت ان کی مذہبی مخالفت کی وجہ سے نہ تھی، میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ قرون وسطیٰ میں اسلامی ممالک میں عیسائیوں کی تاریخ کا تذکرہ کروں مگر ان دونوں قوموں کے درمیان لامحالہ ظلم وتعدی کا واقع ہونا ایسا ہی بدیہی امر تھا جیسا کہ دریا میں مد وجزر رونما ہوا کرتا ہے لیکن مورخین احوال وظروف سے قطع نظر محض واقعات کی جمع آوری سے رائے اخذ نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کی رائے اسباب حوادث کے مطالعہ اور ان کے ظہور پذیر ہونے کی نوعیت وکیفیت کی آگاہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، میں نے تاریخ پڑھی ہے اور تاریخ کے مطالعہ کے بعد میرا عقیدہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے عیسائیوں کے ساتھ جو سلوک اور روش اختیار کی تھی وہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ درشت اور سخت گیر نہ تھی، بلکہ ان کی رفتار وگفتار اور سیرت وکردار نہایت معتدل اور متوسط تھی، یہ ایسا احساس ہے جو اس زمانے کے غیر مسلموں کے اندر مشاہدہ میں نہیں آیا، بالخصوص انسانی شفقت ومحبت کے جذبات اہل یورپ کے نزدیک کمزور پڑ چکے تھے۔

قرطبہ میں ایذا رسانی اور اجبار دینی | علاوہ بریں یہ بحث ایک

حادثہ کبریٰ کا ذکر کیے بغیر تشنہ اور ادھورا رہے گا، وہ حادثہ یہ ہے کہ اہل کلیسائے اندلس نے ۸۵۱ء میں یہ خیال کیا کہ عن قریب مسلمان اُن کو صدمہ اور اذیت پہونچانے والے ہیں، حالانکہ تمام عیسائی قرطبہ میں کمال اطمینان سے اپنے مذہبی شعائر اور ملی روایات انجام دے رہے تھے، اور اُن کو عربوں کی حکومت سے کوئی شکوہ و شکایت نہ تھی، ایسے وقت اور ایسی حالت میں چند عیسائی افراد کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف غیظ و غضب کے جذبات پرورش پا رہے تھے، اس کا سبب یہ تھا کہ راہبوں اور پادریوں نے اُن افراد کے نفرت آلود جذبات کو تیز کر دیا اور اُن کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف بغض و کینہ کی چنگاریاں بھر دیں، پادریوں کے درمیان ایلوغو کو اس کام میں امتیاز حاصل تھا، قرطبہ میں یہ ایک ایسا پادری تھا جو عنفوانِ شباب کی منزل میں قدم دھر چکا تھا اور اپنے ہیجانِ نفس کو ساکن اور قوائے شہوانی کو زیر کرنے کے لیے روزہ داری اور شب بیداری کا محتاج تھا، اور اپنے کو محبت مسیحؑ کی راہ میں مرمٹنے کے لیے وقف کر دیا تھا، یہ میلان اس کی نظروں سے ہر قسم کی دنیوی خواہشات کو اوجھل کیے ہوئے تھا، یہ ہمیشہ دشمنانِ اسلام کی صحبت میں رہتا تھا، اُن کے جذبات کو اپنی تقریر کے ذریعہ بھڑکاتا تھا، یہاں تک کہ اپنی قوتِ بیان سے اُن کے دلوں میں ہیجان پیدا کر دیا اور وہ دین کے راستہ میں خود کو قربان کرنے کے لیے بے تابانہ موت کے طلبگار ہو گئے۔

اندلسی خوش عقیدہ ہوتا اور بہت جلد موہومات کے رنگین جال میں گرفتار ہو جاتا ہے، جس وقت قاضی قرطبہ اپنے اجلاس پر بیٹھا ہوا تھا ایک راہب

اِسحٰق نامی جو ایک امیر عرب کا منشی تھا وارد ہوا، اُس کے چہرے پر اُس کے قلبی ہیجان کے آثار ہویدا اور اُس کی آنکھیں دگرگوں تھیں، قاضی کے روبرو آکر کہا میں اِسلام لانے کے لیے حاضر ہوا ہوں، قاضی نے شہادتین پڑھنے کا حکم دیا اُس نے پیغمبرِ اِسلام اور دین پر طعن و تشنیع اور گالیوں کی بوچھاڑ شروع کردی، قاضی نے خیال کیا کہ شرابی یا دیوانہ ہے، اِس لیے اُس کے قتل کا حکم صادر کرنے میں پس و پیش کر رہا تھا، مگر اسحٰق نے ایک ہی مرتبہ فحش گوئی پر اکتفا نہ کی بلکہ مسلسل گالیاں دیتا رہا، یہاں تک کہ قاضی اپنی قوت برداشت کے باوجود جو اُس کی فطرت میں ودیعت تھی، شرعی احکام کی بجاآوری کی خاطر اُس کے قتل کا حکم صادر کرنے پر مجبور ہو گیا، کیوں کہ شریعت اُس شخص کو جو پیغمبر کی شان میں گستاخیاں کرتا اور گالیاں دیتا ہے قتل کا حکم دیتی ہے، بنابریں اسحٰق ۵ جنوری ۸۵۱ء میں اس حال میں قتل کر دیا گیا کہ مسیح کا اقرار کرتا تھا اور محمدؐ کو گالیاں دیتا تھا، اس وقت سے ہر شخص کے لیے جو خود کو سزا و عذاب میں مبتلا کرنا چاہتا تھا، راستہ کھل گیا، اِس گروہ میں سے ہر ایک کی خواہش یہی تھی کہ عدالت میں جائے، محمدؐ کو گالیاں دے اور مر جائے، چنانچہ یہ لوگ دستہ دستہ عدالت میں اِس طرح لوٹ پڑے کہ دربانوں کو اُن کے ہجوم کو باز رکھنے کے لیے بڑی جدوجہد کرنی پڑی، قاضی نے اپنے کان پکڑ لیے کہ اُن کو قتل کا حکم نہ دے گا، مسلمانوں کا عقلمند گروہ اُن بے چاروں پر ترس کھاتے اور افسوس کرتے تھے کہ مذہب نے اُن کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے، یہ اُن کو دیوانوں میں شامل سمجھتے تھے۔ دو ماہ کے اندر جن اشخاص کو قتل کا حکم دیا گیا اُن کی تعداد گیارہ تھی، ایلوخو نے

اِس تعداد میں قتل کیئے جانے کو اپنے غلبہ کیلیے دلیل ٹھرایا، کو اب اس کے ذریعہ اس نے مذہبی مظالم اور اجبار دینی کے جذبات کو لوگوں کے ذہنوں میں پیدا کر دیا ہے، اِس لحاظ سے وہ حقدار ہے کہ اس کا نام کلیساؤں میں ہمیشہ باقی و زندہ رہے، اِس کوشش وجد وجہد کے باوجود مسیحی عقلمند طبقہ کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ متعصب اشخاص خودکشی کرنا اور اپنے کام کو برملا مشہور کرنا چاہتے تھے، ایلوغو اور اُس کے رفیق کار رقاذو مسیحی عقلاء کو اس بنا پر کہ وہ پیغمبر اور دین اسلام کو طعن وتشنیع نہیں کرتے ہیں خیانت کے اِلزامات عائد کرتے تھے اس کی وجہ سے اندلس کے کلیساؤں میں ہیجان شدید برپا ہوگیا اور اکناف واطراف اِضطراب وخلفشار کا موجب بن گیا، اِس لیے امیر عبدالرحمٰن دوم نے جلیل القدر علماء کو جمع کیا اور اُن سے خواہش کی کہ مسیحی طبقہ کی بغاوتوں اور شرارتوں کے باب میں کوئی فتویٰ صادر کریں، اُنھوں نے گذشتہ حالات وواقعات سے قطع نظر کرکے کہا کہ آئندہ اُن کو اِس قسم کے حرکات انجام دینے سے باز رکھنا چاہیئے، چنانچہ یہ فیصلہ ہوا کہ آئندہ کوئی مسیحی قاضی کے رُوبرو حاضر نہ ہو عیسائیوں نے حسرت وتاسف کے ساتھ اس فیصلہ کو تسلیم کرلیا، لیکن ۸۵۹ء تک کلیساؤں میں اُن کے دِلوں کا ہیجان وطوفان مسلسل برپا تھا، یہ دور جس کو ایلوغو قرطبہ کے آزار واذیت دینی کے زمانے سے نامزد کرتا ہے۔ اور دیگر مؤرخین نے بھی اِس کا اِتباع کیا ہے، ختم ہوگیا؛

جس شخص کا دِل خودغرضی کے لوثوں سے پاک ہے اِس باب میں اِس سے بڑھ کر اور کوئی خیال ظاہر نہیں کرتا کہ یہ ایک جماعت تھی جس نے

خود کو خطرات کی وادیوں میں ڈال دیا اور موہوم تصورات پر قربان ہو گئی لیکن مسلمانوں کی طرف سے کوئی مذہبی ایذا رسانی اور آزار سرزد نہیں ہوئی ہے، اس پر دلیل خود ایلوغو کی کتاب ہے اسی طرح دوسروں کی کتابیں ہیں جو ایلوغو کے بعد پیدا ہوئے، اس لحاظ سے یہ کتابیں اس امر پر گواہ ناطق ہیں کہ مسلمانوں نے ابتداءً اذیت پر اقدام نہیں کیا، بلکہ تمام مصیبتوں کا سرچشمہ اور تمام آفات کا سبب عیسائیوں کی ہیجان خیزی اور شرارت پسندی تھی، جس کا خمیازہ ان ہی کو بھگتنا پڑا۔

فلورائے عذراء کی مذہبی اذیت

جو شخص مذکورہ بالا کتابوں کا مطالعہ کرے گا تو آخر میں وہ ایک ایسی لڑکی کی داستان سے آگاہ ہوگا جو فلورا سے نامزد ہے، فلورا ایسے ماں باپ کے بطن سے پیدا ہوئی جو دین اور قومیت میں جدا جدا تھے، بچپن ہی میں وہ یتیم ہو گئی، ماں نے اس کو مسیحی مذہب پر پرورش کی، اس کا ایک بھائی تھا جو اسلامی عقائد و اعمال میں مستحکم و استوار تھا، اس نے اپنی بہن کی شکایت قاضی کے روبرو کر دی، فلورا پر اس حد تک تعزیری تازیانے برسائے گئے کہ اس کی گردن کی کھال پیچھے سے پھٹ گئی، یہ لڑکی بے انتہا حسین و جمیل تھی، اس کے ماں باپ بھی بڑے خاندان سے تھے، اتفاقاً جو زخم اس کو پہونچا تھا اس نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا، پیرد این ایلوغو نے اس کو بڑی اہمیت دے دی اور اس کو دیکھنے کے لیے عدالت میں جاتے اور اس نے اپنے دین کی پابندی میں جس ہمت و شجاعت کا مظاہرہ کیا

اُس پر اظہار تعجب کرتے تھے، ایلوغو خود اُس کی ملاقات کے لیے گیا، اُسکی گردن کا زخم دیکھا اِس غرض سے نہیں کہ وہ اُس کی زیب و زینت کا موجب تھا، یہ متقی اور صالح شخص لڑکی کا نظارہ کر کے متاثر ہو گیا اور محبت نے اُس کے دِل میں اپنے قدم جما لیے، لیکن یہ پاک اَفلاطونی محبت تھی، اِس قدر پاک جیسا کہ لڑکی، اُس نے اپنا ہاتھ زخموں پر رکھ دیا اور دل میں یہ تمنا موجزن کہ کاش اُس کو اپنے لبوں سے شفا دے سکتا لیکن یہ تمنا اُس کی پُوری نہ ہو سکی اور حزن والم اور تردد فکر کے گہرے جذبات دِل میں اُٹھائے ہوئے واپس ہوا، فلورا مسلمانوں کی نگاہوں سے دور زندگی گذارتی تھی، اپنے گھر سے باہر نکلتی بھی تھی تو صرف کلیسا تک، کلیسا میں ایک اور لڑکی مریم نام سے اُس کی دُوستی ہوئی، اُس کا ایک بھائی تھا جس کو قتل کرنے کا حکم دے دیا گیا تھا، مریم بھی چاہتی تھی کہ اپنے بھائی کا کام انجام دے، فلورا کی مریم کے ساتھ یہ آشنائی اِس امر کا موجب بن گئی کہ اُن کے باہمی خیالات ایک دوسرے کو تقویت دیکر یک بہم پہونچائیں نوبت یہاں تک پہونچی کہ دونوں موت کی طلبگار ہو گئیں اور عدالت میں قاضی کے روبرو پیغمبر اسلام کی شان میں گستاخیاں کرنے اور توہین آمیز باتیں کہنے کے لیے گئیں، لیکن قاضی نے اُن کی جوانی اور حُسن وجمال پر ترس کھایا اور اُن پر قتل کا حکم صادر کرنے میں تاخیر کی اور اُن کو قید خانہ میں رکھنے کا حکم دیا، چونکہ ارادہ کی ثابت قدمی اور قوتِ برداشت تمام چیزوں سے زیادہ دُشوار ہے خصوصاً اُن طبائع میں جن میں تاثر و انفعال کی خاصیت زیادہ ہے یہ دونوں لڑکیاں چند ماہ قید خانہ میں فسق وفجور کی حالت میں رہیں، اِس لیے

جس عزم و استقلال سے موت کے منہ میں جلنے پر آمادہ تھیں اب وہ کمزور دست ہو گیا، لیکن ایلوغو کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ ایسے شخص کو فراموش کردے جس کے زخم کا نظارہ کرنے کے پہلے ہی روز سے ایک طرح کا احساس، جو عشق و دیوانگی سے قریب تھا، اس کے دل میں جاگزیں ہو چکا تھا، اتفاقاً وہ بھی مخالفت اور دشمنی کی بنا پر خلیفہ کے حضور میں علماء کے فیصلہ کے مطابق نظر بند ہو گیا، اب قید خانہ میں فلورا سے ملاقات کرنا اس کے لیے آسان ہو گیا، یہ ملاقاتیں اس کے دل پر بے حد اثر انداز ہوتی تھیں، لیکن ان تمام پر دین کی محبت غالب تھی، اس لیے اس نے لڑکی کو ثابت قدمی، استقلال کا جوش دلایا اور دامنِ مسیح کو مضبوطی سے تھامے رہنے کی ترغیب دی یہاں تک کہ از سرِ نو لڑکی کو مصائب اور سختیاں جھیلنے پر تیار کر دیا، مگر ایلوغو کا دل مذہب سے لگاؤ رکھنے کے باوجود اپنے اندر ایک دنیوی معاملہ اور ایک قسم کے جذبہ کا احساس کرتا تھا اور فلورا کی مفارقت سے بے انتہا غمگین و ملول ہو جاتا تھا لیکن زیادہ روز سے رکھنے اور صبر کا رہنے کی وجہ سے اپنے نفس پر قابو پالیا، خدا نے چاہا کہ اس کا یہ عذاب طول نہ کھینچے اس لیے ۲۴ نومبر ۸۵۱ء کو دونوں لڑکیاں انتقال کر گئیں، اس کے بعد ایلوغو کو قید خانہ سے رہا کر دیا گیا اور ۱۱ مارچ ۸۵۹ء میں وہ بھی اس دنیا سے چل بسا۔

مراکش میں مسلمانوں کا مذہبی جبر و قہر اسپین سے یہ ہیجان انگیز فتنہ نویں صدی کے آخر ہی میں جا کر ختم ہوئی، اس کے چند عرصہ بعد اشبیلیہ میں مذکورۂ بالا مظاہرہ کیا گیا، اس کی

تفصیل یہ ہے کہ مقدّس فرانسوی واسیہز نے اپنے چند مذہبی پیروؤں کو مسیحی مذہب کی نشر و اشاعت کے لیے بلادِ مغرب میں روانہ کیا، سب سے پہلا کام مبلغین نے یہ کیا کہ جس وقت مسلمان نماز میں مشغول تھے، یہ اشبیلیہ کی مسجد میں داخل ہو گئے اور انجیل کی اشاعت اور لوگوں کو مسیحی مذہب کی دعوت دینی شروع کر دی، یہاں سے اُن کو نکال دیا گیا، لیکن یہ بادشاہ کے محل کے سامنے پہونچ گئے اور قرآن کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنانے میں مصروف ہو گئے، بادشاہ نے حکم دیا کہ ان کو ایک منارہ میں نظر بند کر دیا جائے، یہ لوگ منارہ کے اوپر چڑھ کر لوگوں کو دینِ مسیح کی تبلیغ کرتے تھے، بادشاہ نے مجبوراً ان کو شہر بدر کر کے مراکش بھیج دیا، انھوں نے مراکش میں اپنی تحریکات اور کارروائیوں کو تیز کر دیا، ڈان نیبر کی سفارش بھی، باوجود سے کہ وہ امیر مراکش کے نزدیک بہت زیادہ مقرب تھا، کارگر نہ ہوئی آخر ۱۶ ؍ جنوری سنہ ۱۲۲۰ء میں اُن کو قتل کر دیا گیا۔

اسلامی رواداری کے نتائج۔

مغرب میں اسلامی دین کی نشر و اشاعت کے زمانے میں مسلمانوں کی رواداری اور اُن کے صلح جویانہ اور امن پسندانہ طریقے کے باب میں ہم نے تفصیل سے اسلیے بحث کی ہے کہ عیسائیوں کے ذہنوں میں خلافِ واقعہ امور جاگزیں ہو چکے تھے اور آج تک اُن کے نفوس میں محکم اور راسخ ہیں، مورخین اور وہ لوگ جو ممالکِ مشرق کی سیر و سیاحت کر چکے ہیں اِن موہومات کے خلاف بہت کچھ اپنے خیالات ظاہر کر چکے ہیں، میشو صلیبی جنگوں کی تاریخ میں کہتا ہے کہ "جس وقت

حضرت عمرؓ شہر اورشلیم پر قابض ہو گئے کسی قسم کا نقصان عیسائیوں کو نہ پہونچایا لیکن جب عیسائی اس شہر پر مسلط ہوئے تو مسلمانوں کو بے دریغ قتل کیا، ان پر ذرا بھی رحم نہ کھایا اور یہودیوں کو نذر آتش کر دیا" محقق ہیشون کہتا ہے:۔

"جو چیز عیسائیوں کے متعلق افسوس ناک
اسباب کا موجب ہے یہ ہے کہ ان کے بارے میں
مسلمانوں کی طرف سے رواداری اور مصالحت
کا طریقہ اختیار کیا جائے حالانکہ قوموں کے درمیان
مصالحت و مفاہمت عظیم الشان خوبیوں میں سے ہے"

اسلام تمام مشرقی ممالک عرب اور تمام براعظم ایشیا میں بارہویں اور چودہویں صدی کے مابین پھیل گیا، مسلمانوں کی طرف سے کوئی ظلم اور کوئی جنگ واقع نہ ہوئی، یہاں تک کہ مسلمان حکام خود شہر بنارس کا احترام کرتے تھے، اس لیے کہ یہ شہر ہندوؤں کے پاس مقدس و متبرک شہر شمار کیا جاتا تھا، حالاں کہ یہاں کے باشندے تقریباً برہمن تھے، الغرض اسلام جس شہر میں داخل ہوا سبھی ادیان کے درمیان اس کو پہلا مقام حاصل ہو گیا، لیکن اس نے کسی کے دین و مذہب سے تعرض نہ کیا، اس بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دینِ اسلام قوت و طاقت کے ذریعہ نہیں پھیلا، بلکہ زیادہ درست اور صحیح یہ ہے کہ مسلمانوں کی بیش از بیش رواداری، مصالحت و امن پسندی مملکت عربیہ کے سقوط کا سبب ہوئی، مورخین فرانس میں نہر لوار تک اسلام کی نشر و اشاعت کی تیز رفتاری پر تعجب کرتے ہیں اور سوال کرتے ہیں کہ

اگر کارلوس مارٹل مسلمانوں کے اقدام کو پواتیر کے میدانوں اور صحراؤں میں نہ روک دیتا تو یورپ کا کیا حال ہوتا' ہمارے خیال میں یہ سوال ترتیب کے خلاف ہے اس طرح سوال کیا جائے تو بہتر ہوگا کہ اگر مسلمان متعصب ہوتے تو مسیحی یورپ کا انجام کیا ہو جاتا' اس کی وجہ یہ ہے کہ پواتیر کے میدانوں میں مسلمانوں کی شکست اسلام کی نشر و اشاعت کی راہ میں رکاوٹ کا کوئی بڑا سبب نہ تھا' جیسا کہ موسیو مرسیہ نے اس مفہوم کی طرف درست اشارہ کیا ہے اور جنگ میں ایک مرتبہ مغلوب ہو جانا اس بڑے سبب کا نتیجہ نہیں ہو جاتا' کیونکہ جنگ کا معمول ہی غالب و مغلوب ہونا ہے' کتنی ایسی شکستیں ہیں جو اپنے مستقبل میں بہت بڑے غلبہ کا پیش خیمہ ہو گئی ہیں' موسیو مرسیہ یورپ سے عربوں کے لوٹ جانے کی علت اس جنگ کے بعد ایک ایسے انقلاب کو قرار دیتا ہے جو اہل مغرب کے درمیان واقع ہوا' کیونکہ یہ انقلاب مسلمانوں کے لیے مغرب سے جو مدد و کمک پہونچتی تھی اس کی راہ میں رکاوٹ بن گیا' یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی جنگوں میں بہترین لشکر مغربی فوجیں تھیں' یہ ایک محکم سبب ہے لیکن ہم یہ فراموش نہیں کر سکتے کہ اس شکست کے اسباب میں مسلمانوں کی کثرت سفاہت و رواداری کو بھی شمار کریں کیونکہ اس سامحت و مسالمت نے تمرد و بغاوت کے عناصر کو مضبوط ہونے کا موقعہ سہل کر دیا اور مغرب کے بعض خود مختار قبیلوں کو بلاد اندلس اور ممالک مغرب میں اسلامی جمعیت سے علم بغاوت بلند کرنے کا سامان فراہم کر دیا' اس حسن سلوک اور عادلانہ روش کا انجام یہ ہوا کہ مملکت عربیہ کے عناصر کمزور پڑ گئے' قیاس یہ ہے کہ عیسائیوں نے سکرلی

اور لونڈی قوموں کے ساتھ جو معاملہ کیا اگر مسلمان بھی اہل اندلس کے ساتھ
وہی معاملہ کرتے رہتے تو اسلام اندلس میں پائدار اور مستحکم ہو جاتا، اس لیے کہ
اہل اندلس باوجود اس کے کہ مسیحی مذہب کی آزادی سے بہرہ ور ہوتے تھے، لیکن
وہ بہت ہی پراگندہ اور بکھرے بکھرے سے تھے، اس قسم کے مظنونات اور
اندازوں کا ہم سے تعلق نہیں ہے، ہمارے پیش نظر ایک ہی چیز ہے جس سے
ہمیں آگاہ ہونا چاہیئے وہ یہ ہے کہ قرآنی نظریات و اثرات شمالی افریقہ اور
ایشیاء کے اکثر خطوں کے تمام یہودی، مسیحی اور بت پرست قوموں کے
دلوں میں جاگزیں ہو گئے حتیٰ کہ بلادِ اندلس میں بعض متنور الفکر مسیحی پیدا
ہوئے جنھوں نے دینِ اسلام کی محبت کی بدولت اپنے دین کو چھوڑ دیا،
اُن کا تمام تر سبب کسی قسم کا جبر و اکراہ نہ تھا، لیکن صرف جبر و اکراہ اسی حد تک
تھا جو فاتح قوموں کی حکومت و سیادت اور جنگ کا لازمہ ہے بدون اس کے کہ
اسلام اپنے دین کی نشر و اشاعت کے لیے مخصوص مبلغین اور مخصوص اشخاص
کو رکھتا ہو، یہی حقیقت ہمارے لیے کافی ہے کہ اسلام میں جاذبیت اور نشر
و اشاعت کی قوت موجود ہے، ہم بعد میں اس جاذبہ کے حقیقی سبب سے
بحث کریں گے کیونکہ اسلام ہنوز نشر و اشاعت کے عبوری دور سے گزر رہا ہے
قبل اس کے کہ ہم اسلامی انتشار و ترویج کے اسباب سے بحث کریں قارئین
کی آگاہی کے لیے ان امور کو ذکر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں جن کو اسلامی
انتشار کے اسباب میں سے شمار نہ کرنا چاہیئے جیسا کہ بعضوں نے گمان
کر لیا ہے کہ دینِ اسلام کا انتشار صرف اس لیے ہے کہ اس میں اخلاقیت و

روحانیت کے مقابلہ میں مادیت زیادہ ہے کیونکہ اسلام نے تعدد زوجات کو جائز قرار دیا ہے اور اپنے پیروؤں کو ان جنتوں میں لذائذ و شہوات سے لطف اندوز ہونے کا وعدہ کیا ہے جن کے اوصاف و خصائص میں بے انتہا مبالغہ و رنگ آمیزی کی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کو دشمنانِ دینِ اسلام نے ایک عرصہ تک اس دین میں طعن و تشنیع کے اسباب قرار دیا تھا، نیز ہم قضا و قدر پر بھی کچھ روشنی ڈالیں گے، اس لیے کہ بعض عاقبت نا اندیش اسلام کی نشر و اشاعت کا اہم سبب اور مسلمانوں کی بے پناہ شجاعت کی علت جو ان کا ایک امتیازی شعار رہے اور جنگ کے موقعوں میں موت کی کوئی پروا نہیں کرتے ہیں، اسی قضا و قدر کے اعتقاد کو سمجھے ہوئے ہیں۔

اور بالخصوص ہمارے دینی شعائر و خصائص کو گھائل کرتا ہے، ہم موسیٰ کی شریعت میں تعددِ زوجات کے کوئی معنی نہیں پاتے، حالانکہ وہ بھی شریعت مسیح کی مانند ایک شریعت ہے، پوپ بر وشلے دعویٰ کرتا ہے کہ

"تعددِ زوجات ایک ایسا مذہب ہے جس کے مفہوم کا سمجھنا ہمارے لیے مشکل ہے اور خدا نے اس کو مخصوص احوال و ظروف کے مطابق جن کا سمجھنا ہمارے فہم و تدبر کے امکان سے باہر ہے، حلال کیا ہے۔"

گویا بر وشلے اور اس کے متبعین اس حیثیت سے دینِ مسیح پر خوف کھاتے ہیں کہ دینِ اسلام عیسوی و موسوی دین کو باہم پیوستہ کرنے والا ہے کیونکہ یہ دونوں اسی کی طرح آسمانی ہیں، ان دونوں دینوں میں ایسے آداب و تعلیمات ہیں جو دینِ مسیح کی تعلیمات و احکام سے مغائر و متضاد ہیں، لیکن میں اس اعتقاد کے لیے کوئی مانع نہیں پاتا کہ شارع الٰہی میں بھی وہی حکمت ہے جس کا ہم عام مقنن و شارع میں یقین و اعتقاد رکھتے ہیں، تمام انسانی قوانین اپنے نصوص و احکام میں احتیاط اور احکام و قوانین کے بیان کرنے کے مقام پر زمان و مکان اور احوال و ظروف کی رعایت کرتے ہیں کوئی وجہ ہمیں مجبور نہیں کرتی کہ ہم شارع الٰہی پر اس قسم کی احتیاط کو ممنوع سمجھیں، یہ بات ہے ایک بہت بڑے متکلم اور فلسفی موسیو ڈالسٹ کی جو کہتا ہے کہ سب سے پہلی اخلاقی شریعت جسے خدا نے لوگوں پر اتارا انسانی احوال

وطرز تمدن کے موافق ہم آہنگ اور زمانہ اور انسانی اخلاق و آداب کے
درجہ کے مناسب و موزوں تھی، مسلمانوں کے آداب میں ایک نقص ہے
جو اُن کی اصلی سرشت و خلقت کے ساتھ وابستہ تھا، اور جس کا علاج کثیر برتوں
تک بھی ممکن نہیں ہے وہ عیب اُن کی کثرتِ شہوت ہے، ہرچند یہ صفت
بجائے ایک اخلاقی عیب و کمزوری ہے مگر یہ قوتِ جسمانی اور قومی و نسلی
توانائی و صحت کی دلیل ہے، اس لحاظ سے ایک مشرقی انسان کی قوت
اور جوش نشاط ایک مغربی سے زیادہ ہے، یہی وجہ ہے کہ جو لوگ قوموں
کے طبائع و امزجہ کے علم میں منہمک ہیں انھوں نے کہا ہے کہ تعدد زوجات
مشرقی قوموں کی ضروریات میں سے ہے، جس کا سبب اُن کی قوت کی
زیادتی ہے جو اُن کے اندر موجود ہے، امورِ الٰہیہ کے عجائب و غرائب میں
سے جن کے فہم و ادراک میں عقل حیران ہے یہ ہے کہ اہلِ مغرب تعدد
الٰہہ کے اعتقاد کی وجہ سے ہمیشہ ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کو ممنوع
قرار دیتے ہیں اور اہلِ مشرق جو ایک خدا کے سوائے کسی کی پرستش نہیں
کرتے تعدد زوجات کے قائل ہیں، پس بے شمار خدا اور ایک عورت
ایک ایسا صیغہ ہے جو اہلِ مغرب کی عادت کے مناسب و موزوں ہے
اور خدائے واحد اور زوجات متعددہ ایک ایسا صیغہ ہے جو اہلِ مشرق کے
ہم آہنگ و سزاوار ہے؛

اہلِ مغرب کے لیے یہ دشوار ہے کہ تعدد زوجات کے باب میں
قرآنی شریعت کی کما حقہا قدردانی کریں، کیونکہ اہلِ مغرب اور اہلِ مشرق

کے درمیان نسل، قوم، دین اور تمدن میں اختلاف کلی ہے یہی وجہ ہے کہ
بعض امور میں سے جن کا سمجھنا نہایت اہم ہے اور جن پر اہل بحث و تحقیق
کو کسی قسم کا اعتراض نہیں یہ ہے کہ تعدد ازدواج اسلام سے قبل عربوں کی
قدیم عادت رہ چکی ہے، اس لحاظ سے مساجد کے وجود میں آنے کی نسبت
بکثرت عورتوں سے شادی کرنا قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے، یورپ کے دعوے
کا یہ قول کہ متعدد عورتوں کا رکھنا اسلام ہی کی پیداوار ہے بالکلیہ غلط ہے،
کیونکہ یہ امر مسلمہ ہے کہ جو قبائل عرب ابتداءً اسلام لائے وہ اسی تعدد ازدواج
کے مسلک پر قائم تھے، جیسا کہ سیاہ فام قومیں جو ان دنوں تمام اسلام کی
طرف مائل ہو گئی ہیں، اسی مذہب کی پابند ہیں، یہ مذہب ان قبائل میں
اور سیاہ فام قوموں میں قرآن کے پیش کردہ ازدواجی اصول سے بڑھ کر
اپنے اندر وسعت رکھتا ہے، قرآن مجید چار عورتوں سے بڑھ کر اجازت
نہیں دیتا، یہی وجہ ہے کہ یہ گروہ پیغمبر اسلام کے بارے میں یہ نظریہ رکھتے
ہیں کہ آپ ایک شدید یا انتہا پسند مصلح ہیں، بلاشبہ آنحضرت کا میلان ابتداءً
یہ تھا کہ ایک ہی عورت پر اکتفا کریں جیسا کہ آپ نے ابتدائے عمر میں اسی
ایک عورت پر اکتفا کیا، لیکن قوم قریش کو ایک ہی عورت پر منحصر کر دینا
نہایت مشکل کام تھا، قریش کے درمیان حارثہ اور غیلان جیسے اشخاص
تھے جن میں سے ہر ایک کے پاس دس دس عورتیں تھیں جنھوں نے اپنی ان
عورتوں کے ساتھ اسلام قبول کیا، پس اگر ان کو ایک ہی عورت پر اکتفا
کرنے کا حکم دیا جاتا تو ان کی طبیعت پر بہت ہی گراں گزرتا اور اس کا بُرا

اُن کے لیے دشوار تھا، اور یہ بات ناقابلِ قبول تھی کہ دین میں اُن کے عقیدہ و ایمان کے متزلزل ہو جانے کا موجب ہو جاتا، اسی لیے آپ نے حکم دیا کہ اپنی متعدد عورتوں میں سے چار عورتیں منتخب کر لیں اور باقی عورتوں کو طلاق دے دیں۔ تو یہ ان کو تعجب نہ کرنا چاہیے اگر ہم نے پیغمبر اسلام کے تعدد ازدواج کا ذکر نہیں کیا، اس لیے کہ اس کے چند گوشوں پر ہم نے باب اوّل کے آخر میں روشنی ڈال چکے ہیں، اس کے بعد بھی ہم اس پر بحث کریں گے۔

تعدد ازدواج قرآن میں

ایک ہی عورت کو ترجیح دینے کے بارے میں دین اسلام کا میلان چوتھے سورہ کی تیسری آیت سے ظاہر ہوتا ہے جس میں عورتوں کی تعداد کا جو مباح ہے تعین ہوتا ہے۔

وان خفتم الا تقسطوا فی الیتامیٰ فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلاث ورباع فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ او ما ملکت ایمانکم ذالک ادنیٰ الا تعولوا ۔ (النساء)

اور اگر تم کو اس بات کا احتمال ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو اور عورتوں سے جو تم کو پسند ہوں نکاح کر لو دو دو عورتوں سے، تین تین عورتوں سے اور چار چار عورتوں سے، اگر تم کو اس کا احتمال ہو کہ عدل نہ رکھو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو یا جو لونڈی تمہاری ملک میں ہو وہی سہی۔ اس امر مذکور میں زیادتی نہ ہونے کی توقع قریب تر ہے۔

اس آیت کے دوسرے ٹکڑے کے معنی جیسا کہ علماء و مفسرین نے سمجھا
یہ ہیں کہ اگر مرد کو یہ خوف دامنگیر ہو کہ اپنی عورتوں کے درمیان انصاف نہ کریگا
اور اس امر کا اندیشہ ہو کہ ان میں سے کسی ایک کو دوسروں پر ترجیح دے گا
اور وہ ایسے مقام اور حالت پر نہ ہوگا کہ ہر ایک کا حق ادا کر سکے تو اس کو ایک
عورت سے زیادہ شادی نہ کرنا چاہیئے، بعض علماء کا مسلک یہ ہے کہ مسلمان
اپنی قدرت کے وجود اور اپنے لیے تعدد زوجات کے جواز کا حکم لگانے میں
آزاد نہیں ہے، بلکہ قاضی کو اس معاملہ میں فکر و نظر کرنی چاہیئے اور اپنے فہم
و تدبر کے مطابق تجویز پیش کرنا چاہیئے، اگر قاضی مرد طالب کے اندر فقدان
عدالت کی تشخیص کرے تو اس کا حکم یہ ہوگا کہ ایک ہی عورت پر اکتفاء کر لیا جائے
جن لوگوں کی یہ رائے ہے وہ اپنے قول کی تائید میں ذیل کا قصہ پیش
کرتے ہیں کہ

خلیفہ عباسی ابو جعفر منصور اپنی بیوی سے حد درجہ محبت رکھتا تھا
اسی وجہ سے وہ دوسری شادی کرنے کی طرف مائل نہ تھا، لیکن چند سال
مسرت و خوشحالی سے گذارنے کے بعد نئی شادی کا جذبہ اس کے اندر
پیدا ہوا اور دوسری بیوی سے عقد کرنا چاہا، اس کی بیوی نے دیکھا کہ وہ عن قریب
اپنی سوکن کی مصیبت میں گرفتار ہونے والی ہے اس لیے وہ بظاہر قرآن
کی منکر بن بیٹھی کہ قرآن نے دوسری عورت کو مباح نہیں کیا اور اس کا دعویٰ
یہ تھا کہ خلیفہ کے لیے ایک سے زیادہ شادی کرنا جائز نہیں ہے، خلیفہ نے حضرت
امام ابو حنیفہ رح کو جو ائمہ علماء کبار میں سے تھے طلب کیا اور (شاید مولف کی مراد

امام مجتہد ابوحنیفہ کے علاوہ کسی اور سے ہے) اُن سے پوچھا کہ مرد کے لیے کتنی بیویاں جائز ہیں؟ انھوں نے فوراً جواب دیا چار، خلیفہ نے اپنی بیوی کی طرف جو پس پردہ اُن کی باتیں سُن رہی تھی، متوجہ ہوکر کہا سُن لیا تم نے امام صاحب کیا کہتے ہیں، ابوحنیفہؒ نے جب یہ بات سُنی تو اپنے الفاظ کو توڑ کر کہا "مگر ابوجعفر کے لیے ایک سے زیادہ شادی جائز نہیں ہے" ابوجعفر نے پوچھا "کس لیے؟" امام صاحب نے کہا جس وقت آپ اپنی بیگم صاحبہ کی طرف متوجہ ہوئے اور اُن سے گفتگو کی تو آپ کی آواز سے میں نے یہی سمجھا کہ آپ اس خاتون کے ساتھ عدل و انصاف نہ کریں گے، اس لیے میں اب یہ حکم دیتا ہوں کہ آپ کو ابھی ایک بیوی پر اکتفا کرنا چاہیئے۔[۱]

---

[۱] ابن حزم نے جو مسلمانوں کے نزدیک مشہور مفسر قرآن اور جو منہ(؟) عقیدہ و مسلک رکھتے ہیں، قرآن مجید کے تعدد زوجات والی آیت کی تفسیر تین طریقوں سے کی ہے۔

(۱) عروہؓ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں آپ فرماتی ہیں کہ خدائے تعالیٰ کا مقصد اس آیت سے یہ ہے کہ ان یتیم لڑکیوں کی شادی جو اپنے رشتہ داروں کی زیر سرپرستی ہیں، ایسے اشخاص سے نہ کریں جو ان کے حسن و جمال اور دولت کی خواہش و طمع رکھتے ہوں اور اس قدر مہر نہ دیتے ہوں جو اُن کے لائق و سزاوار ہے، اس لیے خدا نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ ایسی عورتوں کا انتخاب کریں جو حسن و دولت میں ان سے کمتر ہوں تاکہ جو مہر ان کے لیے قرار دیا جائے وہ ان کے لائق ہو بجز اس کے کہ مہر مثل پر تیار ہوں۔

(۲) حضرت حسنؓ سے مروی ہے کہ کچھ ایسے اشخاص تھے جو اپنی رشتہ دار

اس کے بعد میرے مطالعہ میں یہ چیز آئی کہ خلیفہ نے امام صاحب کے حکم کی تعمیل کی یا نہیں، بہرصورت ابوجعفر کا عال وہی تھا جو ہر اس مسلمان کا ہوتا ہے جو زیادہ عورتوں سے شادی کرنے کی طرف میلان رکھتا ہے، درحقیقت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۹) مستورات کے وصی و سرپرست تھے ان سے شادی تو کر سکتے تھے لیکن ان کو عورتوں سے دلچسپی نہ تھی بلکہ ان کے مال و دولت سے تھی، چونکہ اوصیاء کی نظر میں جو حسن و جمال مطلوب تھا وہ ان عورتوں میں نہیں پایا جاتا تھا اس لیے وہ ان کی دولت کے حریص تھے، اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے تھے، پھر ان کو اس بات کا خوف بھی دامن گیر تھا کہ مبادا دوسرے لوگ دخل اندازی کریں اس لیے یہ ان لڑکیوں سے شادی کر لیتے اور ان کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ سے پیش آتے تھے تاکہ وہ فوت ہو جائیں اور جس قدر ان کی دولت ہے وہ سب مردوں کے ساتھ خاص ہو جائے، خدا نے انسانوں کو ان کے اس ظالمانہ فعل سے باز رکھنے کے لیے یہ آیت نازل کی۔

(۳) عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ قریش کے درمیان ایسے اشخاص تھے جو دس اور اس سے زائد بیویاں کرتے تھے ان عورتوں کے لوازم معیشت کے لحاظ سے ان کی حالت فقر و فاقہ کی نوبت پر پہونچ جاتی، اس لیے دختران خوردسالہ (جو ان کی سرپرستی ہوتیں) کے اموال میں تصرف کر بیٹھتے تھے، فقر و افلاس کی حیثیت سے اور یتیموں کے اموال کے ضائع ہو جانے کے لحاظ سے اس ضرر و نقصان کے انسداد کے لیے خدا نے حکم دیا کہ چار عورتوں سے زائد شادی نہ کریں، اسی لیے مذکورہ سورہ کی دوسری آیت

انسان کے اندر عورتوں کے درمیان عدل و انصاف کرنے کی قدرت نہیں ہے
یہی وجہ ہے کہ بہت کم ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ مسلمان قاضیوں کے روبرو
پیش کیا جاتا ہے لیکن شوہر کی قدرت و استطاعت کے مطابق جو ایک سے زیادہ
سے زائد بیویوں کے نان و نفقہ سے متعلق ہے اس مسئلہ کی ترتیب جداگانہ ہے
مثلاً تعدد زوجات کے نہ کرنے کے اسباب میں سے ایک سبب یہ اندیشہ دخیل
ہے کہ اگر بدون توسط قاضی اس پر اقدام کر دیا گیا تو مرد ان کے لوازم معیشت کی
تکمیل سے عاجز ہو جائے گا اسی لیے مشرق میں تعدد زوجات اسباب تجمل
اور سامان شکوہ میں شمار کیا جاتا ہے جو فقرا اور غربا کے لیے بہت کم نصیب
ہوتا ہے اور اغنیا ہی اس سے بہرہ ور ہوتے ہیں حتیٰ کہ ممالک مشرقی میں
تعدد زوجات اغنیا اور ذی ثروت اشخاص کے نزدیک ایک ایسا امر
جو لوگوں کے نزدیک عزت و اقتدار کا لازمہ ہے جیسا کہ قدیم جرمنوں کے نزدیک
شمار کیا جاتا تھا۔

مسلمانوں کے نزدیک تعدد زوجات کا احترام | فرق مراتب اور تعداد زوجات کا نظریہ

مسلمانوں کے پاس کمال رضا اور حسن اعتقاد کے ساتھ مقبول ہے، غربا تعدد
زوجات کے بارے میں نواہی قرآن کو ایسا ہی قبول کرتے ہیں جیسا کہ اس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۰ دیکھیں) نازل ہوئی جس میں حکم دیا گیا کہ یتیموں کا مال، جس وقت کہ وہ
سن رشد کو پہنچ جائیں ان کو واپس کر دیا جائے۔

مسئلہ کے علاوہ دیگر مسائل و امور میں نواہی و محظوراتِ قرآن کا احترام کرتے ہیں
جس طرح خدائے تعالیٰ نے اغنیاء کو تمام حقوق و امتیازات سے نوازا ہے غرباء
ان پر حسد نہیں کرتے اسی طرح تعدد زوجات کی حیثیت سے اغنیاء پر رشک
و حسد آمیز نگاہ نہیں ڈالتے، دوسری طرف وہ جانتے ہیں کہ جو شخص متعدد
بیویاں رکھتا ہے وہ سخت مصیبت و خلفشار میں مبتلا ہے، زندگی کی نعمت
معتدلہ سے وہ شخص بہرہ یاب ہے جس کے پاس ایک بیوی ہو، مذکورہ بالا
بیان کے پیشِ نظر موسیو کاروز کا یہ قول غلط ہے کہ تعدد زوجات مالداروں
کے لیے جائز اور غیروں کے لیے حرام ہے بلکہ مسلمان عورتوں کے باب میں
قرآن سے جو مفہوم مراد لیتے ہیں وہ وہی ہے جیسا کہ مقدس پولس کہتا ہے کہ
"ہر مباح ٹھیک اور پسندیدہ نہیں ہے"۔ بہت سے مسلمان ہیں جو تعدد زوجات
پر جو شریعت نے ان کے لیے مباح قرار دیا ہے، اقدام نہیں کرتے، اس لیے کہ
مسلمان تنگی معاش اور فقدانِ صحت کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں اور تعدد
زوجات سے ان کو ان باتوں کا اندیشہ ہے، اس لحاظ سے غیر مسلموں کا یہ وہم
و خیال کہ اکثر مسلمان تعدد زوجات کے پابند ہیں، خلاف واقعہ ہے، ایسا اکثر ہوتا
ہے کہ عورتیں اپنے شوہروں کی شکایت کرتی ہیں کہ ان کے شوہروں نے ان کو
چھوڑ دیا ہے، ہر روز خانگی جھگڑے اور مناقشے گھر کو جہنم کا نمونہ بنا دیتے ہیں،
عرب مصنفین نے اس بارے میں جو بحث کی ہے اس سے تعدد زوجات
پر ان کے عدم میلان کا پتہ چلتا ہے، جیسا کہ ان کے بعض اقوال کو ہم نے اس
کتاب کے علاوہ دوسری جگہ نقل کیا ہے ایک مصنف کا قول ہے۔

"اے شخص جو دو گھوڑوں پر سوار ہے گر پڑنے
سے ڈر۔ دو شوہر زن کی پرورش بھی کافی ہے لیکن
اگر تو سلامتی اور صلاح چاہتا ہے تو ایک عورت پر
کفایت کر۔"

لگتا ہے یہ دیکھنے میں آتا ہے جو قانون ازدواج میں فقیر و امیر کے درمیان مساوات کا لحاظ نہیں کرتا وہ موجودہ دور میں ہمارے رجحانات و عادات کے مخالف ہے، لیکن جو شخص مسلمانوں کے مزاج سے واقف ہے وہ بخوبی جانتا ہے کہ جو نتائج اس قانون سے اگر وہ ہمارے نزدیک ہو، ہمارے سامنے ظاہر ہوتے ہیں وہ مسلمانوں کے اندر رونما نہیں ہوتے کیونکہ مسلمانوں کا غریب طبقہ اپنی حالت پر رضامند اور خداوند تعالیٰ نے زندگی میں اُن کے لیے حسب ضرورت جو مقدر کر دیا ہے اس پر بطیب خاطر قناعت گزیں ہے، لیکن یورپ دور جدید نے اس حقیقت اور امر واقعہ کے خلاف اپنا نظریہ پیش کیا ہے جو صحیح نہیں، قرآن ایک تہی دست اور بے نوا شخص کو صبر و سکون کی تلقین کرتا ہے۔ نیز وہ اس کو وصیت کرتا ہے کہ فقدانِ استطاعت پر شادی ترک کرے۔ اس

لہ عیسائیوں کا عقیدہ مسلمانوں کے متعلق تعدد ازدواج کے باب میں ہمیشہ سے یہ ہے کہ تعدد ازدواج نفسانی خواہشات اور جسمانی لذائذ سے لطف اندوز ہونے کی ایک صورت ہے، حالانکہ یہ اُن کا محض وہم و گمان ہے، حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور یہ محض نتیجہ ہے اہل مشرق کے اخلاق و خصائص کی غلط نگاہی کا، ہم کہہ چکے ہیں کہ تعدد

باوجود شاذونادر ایسا شخص ہو جس نے شادی نہ کی ہو، عموماً سترہ سال کی عمر میں شادی ہوتی ہے، اہل مشرق تجرد و تنہائی سے آشنا نہیں ہیں، یہ تجرد پسندی اور تنہائی ایک مصیبتِ عظمیٰ ہے جس کو مغربی تمدن نے مغربیوں کے لیے

(بقیہ صفحہ ۱۳۳) مسلمانوں کے نزدیک تعددِ زوجات اپنے افرادِ ملت کے مابین ان کی آبرومندی کے مقتضیات میں سے ہے، جیسا کہ جرمنوں کے نزدیک اس اعتبار سے یہ رائج تھا، بہت سے اشخاص جو ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے ہیں زندگی تقویٰ و وقار کے ساتھ گزارتے ہیں، قارئین میرے ہمراہ آئیں میں شیخ شعرانی کے مقدمہ کی چند جھلکیاں، جو اپنی کتاب میزان الشریعہ میں ذکر کی ہیں، اپنے دعویٰ کی تائید اور ثبوت میں پیش کرتا ہوں۔

"خداوند عالم نے میرے ساتھ یہ خصوصیت رکھی کہ میں ایک شریف خاندان سے پیدا ہوا، لیکن برتری اور فضیلت و فوقیت اس صورت میں باطل اور زائل ہو جاتا ہے جبکہ خوف خدا ہمراہ نہ ہو، خدا نے بچپن ہی سے مجھے اپنی خاص نعمتوں سے نوازا، قرآن کو میں نے حفظ کر لیا، آٹھ سال کی عمر میں کامل قرآن میں نے ازبر کر لیا، نماز پابندی کے ساتھ وقت پر پڑھا کرتا تھا۔"

عمر بھر میں صرف ایک نماز وہ بھی غیر شعوری طور پر میں نے تاخیر سے پڑھی، جس زمانے میں میں بچہ تھا ایسا اتفاق ہوا، قرآن ایک نماز میں پورا پڑھتا تھا، خدا نے مجھے ان لغزشوں سے محفوظ رکھا اور احسان کیا جو خواہشات و شہواتِ نفسانی سے پیدا ہوا کرتی ہیں اور

اوپر کے بیانات سے قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے نزدیک تعدد ازدواج کے نقصانات کے بارے میں لوگوں کے جو خیالات ہیں ان میں مبالغہ اور انتہا پسندی کا رنگ پایا جاتا ہے، لہٰذا تعدد ازدواج نے مشرق میں ان رذائل کو پیدا نہیں کیا جن کی طرف یورپ بار بار اشارہ کرتا ہے، بلکہ مشہور یہ ہے کہ تعدد ازدواج نے برائیوں اور فتنوں کو کم کر دیا ہے، علاوہ بریں مجھے نہیں معلوم کہ یہ رذائل مغرب کے مقابلہ میں مشرق میں زیادہ ہوں، بلکہ میرا تو خیال ہے کہ رذائل کا یہ لیبل ان سیاحوں کے ذریعہ اسلام پر چسپاں کر دیا گیا ہے جو کسی ایک برائی کو ایک فرد میں دیکھتے ہیں اور بلا تحقیق اس کو عام ملت سے منسوب کر دیتے ہیں، اگر وہ ایسا طریقہ اختیار نہ کریں تو اپنی کتابوں کے صفحات کو آخر کن چیزوں سے سیاہ کریں، واقعہ یہ ہے کہ رذائل کا ارتکاب ہر قوم میں موجود ہے، لگا ہے پیرس، لندن، امریکا اور برلن میں ایسے امور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۵) جدا ہوتی جبکہ اس کا بچہ روتا اور اس کے بجائے اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔ اپنی کمال عصمت اور وقار کی بدولت کسی جوانی یا شادی میں نہیں جاتی تھی، ایک دن آشوب چشم میں مبتلا ہو گئی طبیب کو اپنی آنکھ تک نہ دکھائی، چند دن بعد خود ٹھیک ہو گئی، لیکن اس کی اندرونی آنکھ کا گوشہ تنگ ہو گیا اور دوسری آنکھ سے کسی قدر مختلف، یہ اس کے لیے بہ نسبت اس کے کہیں بہتر تھا کہ اپنی آنکھ طبیب کو دکھلائے یہ چار دن بیویاں جنکے عمل خیر پر ابھارنے کا موجب تھیں، میری امداد کرتیں اور مجھے نصیحت کرتیں کہ میں صدقات و خیرات کو مستحق لوگوں تک پہنچاؤں۔

وہ واقعات در پیش ہو جاتے ہیں جو مشرق کے تمام حادثات سے زیادہ ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلام نے بدکاریوں کی تحریم پر بہت ہی زور دیا ہے اور ان کو جرائم صغیرہ میں شمار نہیں کیا، جیساکہ بعضوں نے اس آیت سے سمجھ لیا ہے۔

واللذان یاتیانها منکم فآذوهما فان تابا واصلحا فاعرضوا عنهما ان الله کان توابا رحیما (النساء)

اور جو دو شخص تم میں سے ایسی بدی کریں ان کو ایذا دو پھر اگر وہ توبہ کریں اور نیکی اختیار کرلیں تو ان سے روگردانی کرو بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اگر ان کا یہ خیال صحیح ہو یعنی ہم آیت سے گناہ صغیرہ کا تصور کرلیں تو آیت اپنے حقیقی معنی سے خارج ہو جائے گی اور آیت کی تفسیر امر واقعہ کے خلاف ثابت ہوگی، صرف یہی ایک آیت نہیں جو قرآن میں وارد ہوئی ہو بلکہ اور بھی بے شمار آیتیں ہیں، جیسا کہ سورۂ اعراف میں ہے:

ولوطاً اذ قال لقومه اتاتون الفاحشة ما سبقکم بها من احد من العالمین انکم لتاتون الرجال شهوة من دون النساء بل انتم قوم مسرفون

اور ہم نے لوط کو بھیجا جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم ایسا فحش کام کرتے ہو جس کو تم سے پہلے کسی نے دنیا جہان والوں میں سے نہیں کیا تم مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو، عورتوں کو چھوڑ کر بلکہ تم

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَخْرِجُوهُمْ مِنْ قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ ۝

(الاعراف)

درست کر رکھتے ہو، اُن کی قوم سے کوئی جواب نہ بن پڑا بجز اِس کے کہ آپس میں کہنے لگے کہ ان لوگوں کو تم اپنی بستی سے نکال دو یہ لوگ بڑے پاک صاف بنتے ہیں۔

علاوہ ازیں اسلامی قانون تعزیرات خواہ وہ قرآن سے ماخوذ ہو یا سنت نبوی سے، اِس عمل فاحش کے مجازات و مکافات کے باب میں دیگر قوانین و شرائع سے زیادہ سخت ہیں، اسلامی شرع میں اگر دو بالغ شخص اِس عمل فاحش کے مرتکب ہوں تو ان کی سزا قتل ہے، اگر کوئی بالغ شخص نابالغ لڑکے کے ساتھ اِس فعل منکر کا ارتکاب کرے تو بالغ کی سزا قتل ہے اور لڑکے کو تنبیہ کی جائے گی، اگر دو لڑکے مرتکب ہوں تو ہر ایک کو سو تازیانے لگائے جائیں گے، لیکن افعال قبیحہ جن کی لڑکوں کو اوائل بلوغ میں عادت ہوا کرتی ہے اور اسی طرح اخلاقی فساد مشرق میں نایید ہے کیونکہ یہاں شادی بیاہ آسان ہے، ہاں البتہ اِس کلیہ میں استثنیٰ کی گنجائش ضرور ہے۔

مسٹر اور اُمور سے کے عیسائیوں کا یہ خیال نہایت غلط اور بے جا مبالغہ پر مبنی ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے نزدیک عقد نکاح ایک ایسا معاہدہ ہے جس میں وہ عورت کو فروخت کرتے ہیں، اِس معاملہ سے عورت شوہر کی ملکیت ہو جاتی ہے یہ خیال سراپا جہل پر مبنی ہے اِس لیے کہ عقد نکاح عورت کو ایسے روحانی اور مادی حقوق عطا کرتا ہے جن کے

ذریعہ عورت حیثیت اجتماعیہ میں بلند مقام تک ترقی کر سکتی ہے عورت بھی شوہر سے یہ شرط کر سکتی ہے کہ وہ دوسری کسی عورت سے تعلق نہ رکھے، لونڈی نہ رکھے عورت کی اجازت کے بغیر زیادہ مدت تک گھر سے غائب نہ ہو، بیوی کو اذیت نہ پہونچائے، گالی گلوچ یا پیٹ نہ کرے، گھر کے تکلیف دہ اور مشقت انگیز کام کاج کی اس کو زحمت نہ دے وعلیٰ ہذا القیاس، اگر مرد ان شروط کی پابجائی نہ کرے تو عورت کو حق ہے کہ وہ اپنی طلاق کا مطالبہ کرے، اگر اس سے اپنی طلاق کی درخواست نہ کرے تو قانونی سے یہ مطالبہ کر سکتی ہے کہ وہ شوہر کو طلاق دے دے (خلع لے) یا شوہر اپنی لونڈی کو آزاد کر دے کہ اس کے ساتھ یہ زندگی نہیں گذار سکتی [1]

قرآن مجید نے نہ صرف تعدد زوجات کو محدود کرنے پر اکتفا کیا ہے بلکہ نکاح موقت (متعہ) کو بھی، جو اسلام سے پیشتر عربوں کے پاس عام تھا، حرام قرار دیا ہے، اور یہ حکم تحریم طلاق کے مشابہ ہے کیوں کہ طلاق شرائط مخصوصہ ہی کے ساتھ ممکن ہوتی ہے۔ ان تمام بیانات بالا کے باوجود عیسائیوں کے نزدیک تعدد زوجات، دین اسلام کو قدر و وقعت کی نگاہ سے نہ دیکھے جانے کا موجب ہے، حتیٰ کہ بعض روشن ضمیر مسلمان بھی اس طرف کوئی التفات نہیں کرتے، اگر وہ اپنا کوئی امیر یا مذہبی جمعیت رکھتے (یعنی ایسی حکومت ان کے پاس ہوتی جو دین کی اساس پر قائم ہو اور جو مذہبی احکام اور زمانے کی ضروریات کو

---

[1] یہ عبارت محل نظر ہے اسی طرح اس کے بعد کا بیان بھی

ہم آہنگ کر دے) تو معلوم نہیں کہ تعدد زوجات کی اباحت باقی بھی رہتی۔ موسیو ریفیل کہتا ہے کہ اگر ہم پیغمبر اسلام کے زمانے اور آنحضرت کے مقام ظہور کی طرف رجوع کریں تو ہمیں عورتوں کے لیے اس سے بہتر اور مفید کوئی عمل نہ ملے گا جتنا کہ پیغمبر نے پیش کیا' لہذا عورتیں اکثر امور میں پیغمبر اسلام کی رہین منت ہیں' قرآن حکیم میں عورتوں کے حقوق اور اُن کے متعلق مردوں کے فرائض و واجبات کے باب میں گراں قدر آیات وارد ہوئی ہیں' بعض آیات اُن لذائذ شہوات کی تحریم کے ساتھ مخصوص ہیں جو عورتوں کے لیے جائز نہیں' بعض آیتوں سے خدا کی حلال کردہ اشیاء کو حشمت و وقار کے ساتھ کام میں لانے کی ہدایت کا پتہ چلتا ہے۔

الیوم احل لکم الطیبات وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم وطعامکم حل لھم والمحصنات من المومنات والمحصنات من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم اذا آتیتموھن اجورھن محصنین غیر مسافحین ولا متخذی اخدان ومن یکفر بالایمان فقد	آج تمہارے لیے حلال چیزیں حلال رکھی گئیں اور جو لوگ کتاب دیئے گئے ہیں ان کا ذبیحہ تم کو حلال ہے اور تمہارا ذبیحہ اُن کو حلال ہے' اور پارسا عورتیں بھی جو مسلمان ہوں اور پارسا عورتیں اُن لوگوں میں سے بھی جو تم سے پہلے کتاب دیئے گئے ہیں جب کہ تم اُن کو ان کا معاوضہ دے دو اس طرح سے کہ تم بیوی بناؤ نہ تو علانیہ بدکاری کرو اور نہ خفیہ آشنائی کرو اور جو شخص ایمان

حبط عمله وھو فی الاخرۃ مِن الخٰسرین۔

(المائدہ)

کے ساتھ کفر کرے گا تو اس کا عمل ضائع جائے گا اور وہ شخص آخرت میں بالکل زیاں کار ہوگا۔

مسلمانوں کو عفت و پاکدامنی کی نگرانی کی اس طرح تاکید کی گئی ہے۔

قل للمومنین یغضوا مِن ابصارھم ویحفظوا فروجھم ذلک ازکی لھم ان اللّٰہ خبیر بما یصنعون۔

(النور)

آپ مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں یہ اُن کے لیے زیادہ صفائی کی بات ہے بے شک اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں۔

منکرات سے اجتناب اور اعمال خیر کے اکتساب کی یوں ترغیب دی گئی ہے۔

قد افلح المومنون الذین ھم فی صلاتھم خاشعون والذین ھم عن اللغو معرضون والذین ھم للزکاۃ فاعلون والذین ھم لفروجھم حافظون۔

(المومنون)

یقیناً اُن مسلمانوں نے فلاح پائی جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں جو لغو باتوں سے برکنار رہنے والے ہیں، جو اپنا تزکیہ کرنے والے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

پیغمبرؐ کی زبانی صحابہؓ کو اس قدر سخت احکام مل چکے تھے جو اُن کو نفسانی خواہشات میں بھٹکنے اور عصمت و کمال کے اصولوں کو چھوڑ دینے میں مانع تھے، بنا بریں جو شخص کسی عورت سے منگنی کرے اُس کو بھی اُسے عورت کے چہرہ اور دو ہاتھ دیکھنے کے کسی اور چیز کو دیکھنے کی اجازت نہیں مسلمان کا کسی ایسی عورت پر نظر اُٹھانا جس سے وہ شادی نہیں کرنا چاہتا گناہ ہے انجیل میں مذکور ہے "جو شخص کسی عورت پر شہوت کی نظر کرے گویا اُس نے اُس کے دل سے زنا کیا" مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ "آنکھوں کے زنا کی حرمت دل کے زنا سے بڑھ کر ہے" یہ ایسے احکام و اوامر ہیں جو شہوت رانی اور لذائذ پرستی کو معصیت و گناہ کے مساوی قرار دیتے اور غیر کی بیوی پر نظر کرنے کو حرام کرتے ہیں، جو شخص اُن احکام و اصول پر عمل کرے وہی سچا اور حقیقی مسلمان ہے، قارئین مذکورہ بالا آیات سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے ان فساد انگیز اور فتنہ جو عناصر و عوامل کی جو تعشق و جنسی اختلاط سے پیدا ہوتے ہیں، مسلمانوں کے درمیان سے بیخ کنی کرنے کا کس قدر اہتمام کیا ہے اور شوہروں اور بیویوں کے والدین کو راحت و خوشحالی کی زندگی بسر کرنے کا کتنا بہترین تصور پیش کیا ہے ہر چند انجیل نے زناکاری اور منکرات کے ارتکاب سے روکا اور ان سے اجتناب کرنے کی شدید تاکید کی ہے لیکن انجیل کے احکام پر عمل درآمد کرنے والے وہی شخص ہوتے ہیں جن کو خدا نے خاص قوتوں و ملکات روحانی سے نوازا ہے اور ایسے اشخاص کی تعداد بہت تھوڑی ہے، باقی تو ہیں

پاکیزہ اخلاق و خصائص سے عاری ہیں، مگر قرآنی شریعت نے اخلاق کا ایک لطیف نظام پیش کیا ہے، عام مسلمان اس کی رعایت کرتے اور اس کے مقتضیات پر عمل پیرا ہوتے ہیں، طہارت، پاکیزگی اور حفظانِ صحت کے اصول کی پابندی میں قرآن و حدیث میں جو احکام وارد ہوئے ہیں ان کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں، اس لحاظ سے وہ مخصوص اخلاق و کردار کے حامل ہوتے ہیں اور ان کے نفوس میں حشمت و وقار کے ملکات و خصائص موجود ہیں، یہ تمام صفات و خصوصیات عصرِ حاضر کی متمدن و مہذب قوموں کے آداب و اصول کے بالکلیہ مغائر و مخالف ہیں، ان تعلیمات و احکام نے اہلِ مشرق کے میلانات و عواطف کو مادیت اور لذائذ و شہوات سے نکال کر روحانیت و اخلاقیت کے بلند مقام تک پہنچا دیا، اگر یہ تعلیمات نہ ہوتیں تو ان میں یہ جذبات ناپید ہوتے، مسلمان کے عفت و پاکدامنی کے جذبات اور مسیحی کے حشمت و وقار کے میلانات میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اہلِ مغرب کے حیا سوز اشتہارات جو اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں، ان کی عورتوں کا ایسے لباس پہن کر رقص کرنا جو عریانی و برہنگی کے برابر ہے، ان کی رقص و سرود کی محفلیں جن میں عورتیں اپنے چہرے کھولے اور بازو دونوں ہاتھ برہنہ کئے شریک ہوتی ہیں اور لہو و لعب کے وہ تمام اجتماعات جن میں مردوں اور عورتوں کے کھلے بندوں مظاہرہ ہوا کرتا ہے ان تمام مناظر کو دیکھ کر ایک سچے مسلمان کی نظر مجروح ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی، ایک روز میں نے الجزائر میں وزیر متعلقہ سے

کے گھر میں قبائل کے مشائخ اور سرداروں کی ایک جماعت دیکھی جو دعوت
پر حاضر ہوئے تھے، وہ افریقہ کے ان دور دراز خطوں کے باشندے تھے جو
پاکیزگی اخلاق اور خوبی عادات کا مرکز ہیں یہ اپنے سروں پر عمامے باندھے
ہوئے تھے، ان کے چہروں سے عزت و وقار کے آثار نمایاں تھے، وہ
مسیحی عورتوں کو دیکھ رہے تھے جو اس حالت میں آمد و رفت کر رہی تھیں
کہ ان کے سینے عریاں اور ان کے شانے مردوں کے شانوں کے ساتھ
ملے ہوئے تھے، جو ان کے روبرو رواں تھے، یہ حیا سوز منظر دیکھ کر مشائخ
کے دل جذبات حقارت سے لبریز تھے، ان مشائخ کے مابین جو اشخاص
اپنے قومی عادات و خصائل کے پوری طرح پابند نہ تھے یہ خیال کرتے تھے کہ
یہ جو کچھ مشاہدہ کر رہے ہیں معمولی حالت نہیں ہے جس کے اہل فرنگ تفریح کے
لیئے عادی ہو چکے ہیں، بلکہ یہ خلاف عادت ایک گروہ ہے جس نے اپنی خواہشات
نفسانی کی باگ ڈور ڈھیلی چھوڑ دی ہے اور پردۂ حیا کو اپنے چہروں سے
اٹھا دیا ہے، جو شخص جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے، جیسا کہ سیاہ فام قوموں یا
بعض وحشی قبائل کے درمیان سال میں ایک مرتبہ اس قسم کے مظاہرہ
کا دستور ہے، جس میں اس قبیلے کے ادنیٰ درجہ کے لوگ اس طرح کے کام انجام
دیتے ہیں، لیکن جب ان کی نظر جلسہ کے رئیسوں پر پڑی جو اس جماعت
پر حکمران تھے تو ان کو یہ خیال بدلنا پڑا اور ان پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ
جو کچھ وہ مشاہدہ کر رہے ہیں درحقیقت یہ اس قوم کی عادت و خصوصیت
ہے، اس وقت ان کے ذہن میں اپنی شریعت کی تعلیمات گزرنے لگیں

اور جیسے جیسے وہ اِس ندامت آفریں منظر کا موازنہ قرآنی آداب و اُصول سے کرتے تھے، اُن کے نفوس میں قرآن کی شان و عظمت دوبالا ہوتی جاتی تھی۔

وقل للمؤمنات يغضضن
من ابصارهن ويحفظن
فروجهن ولا يبدين
زينتهن الا لبعولتهن
او آبائهن او آباء بعو
لتهن او ابنائهن او ابناء
بعولتهن او اخوانهن
او بني اخوانهن او بني
اخواتهن او نسائهن
او ما ملكت ايمانهن او
التابعين غير اولي الاربة
من الرجال او الطفل الذين
لم يظهروا على عورات
النساء ولا يضربن بارجلهن
ليعلم ما يخفين من زينتهن
وتوبوا الى الله جميعا

اور مسلمان عورتوں سے کہہ دیجئے
کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اپنی شرمگاہوں
کی حفاظت کریں، اپنی زینت کا مظاہرہ
نہ کریں مگر جو اس میں سے کھلا رہتا ہے،
اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے
رہا کریں، اپنی زینت کو ظاہر نہ ہونے
دیں مگر اپنے شوہروں پر یا اپنے
باپ پر یا اپنے شوہر کے باپ پر
یا اپنے بیٹوں پر یا اپنے شوہر کے
بیٹوں پر یا اپنے بھائیوں پر یا اپنے
بھائیوں کے بیٹوں پر یا اپنی بہنوں
کے بیٹوں پر یا اپنی عورتوں پر یا اپنی
لونڈیوں پر یا اُن مردوں پر جو طفیلی
ہوں اور اُن کو ذرا توجہ نہ ہو یا ایسے
لڑکوں پر جو عورتوں کے پردہ کی
باتوں سے ابھی واقف نہیں ہوئے

ایها المومنون لعلکم تفلحون (النور)

اور اپنے پاؤں زور سے نہ رکھیں کہ ان کا مخفی زیور معلوم ہو جائے، اور مسلمانو! تم سب اللہ کے سامنے توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

شرم و حجاب کی تعلیم میں ارشاد ہوا۔

يا ايها النبى قل لا زواجك وبناتك ونساء المومنين يدنين عليهن من جلابيبهن ذلك ادنى ان لا يعرفن فلا يوذين وكان الله غفوراً رحيما۔ (الاحزاب)

اے نبی! تم اپنی ازواج سے اور بیٹیوں سے اور اہل ایمان کی عورتوں سے یہ کہدو کہ وہ اپنی چادروں سے گھونگھٹ نکال لیا کریں اس سے قرین (عقل) ہے کہ وہ پہچانی جائیں اور ستائی نہ جائیں اور اللہ تو بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

جو لڑکی ابھی جوان نہیں ہوئی ہے وہ شاذ ہی اپنے لیے روادار ہوگی کہ اس کا لباس شرم وحیا اور وقار کے درجہ سے گرا ہوا ہو۔

والقواعد من النساء اللاتى لا يرجون نكاحاً فليس عليهن جناح ان يضعن ثيابهن غير متبرجات بزينة وان يستعففن

اور بڑی بوڑھی عورتیں جن کو نکاح کی امید باقی نہ ہو تو اگر وہ اپنا برقع وغیرہ اتار دیا کریں تو ان کے ذمہ کچھ الزام نہیں ہے جس حال میں کہ ان کو اپنے بناؤ سنگار کا اظہار منظور نہ ہو اور اگر

خیر لهن والله سمیع علیم ۵ (النور)

وہ اُس سے بھی باز رہیں تو یہ اُن کے لیے اور بہتر ہے اور اللہ سُننے والا اور جاننے والا ہے۔

ہم نے اس پہلو پر شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالدی ہے اور اپنے موضوع بحث سے خارج ہو کر مسلمانوں کے اخلاق و خصائص کی ایسے تشریح کی کہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ اِس امر کی قطعی برہان ہے کہ تعدد زوجات کے رائج ہونے کا مقصد یہ نہیں کہ دین اسلام کی نشر و اشاعت کا موجب ہو، اب ایک پہلو اور باقی رہ گیا ہے وہ یہ کہ پیغمبر اسلام نے بہشت کی لطافت آفریں لذتوں اور نعمتوں کا جو وعدہ کیا ہے آیا وہ اِس لیے ہے کہ ابنائے آدم کو اپنی طرف مائل اور اپنے دین کے قبول کرنے کے لیے ہموار کریں یا اُس سے اور اور کوئی اور مقصد و غایت ہے!

باب چہارم

حیات بعد الممات

حیات آخرت مسیحی مذہب میں

جو مذاہب بقاء ارواح کے قائل ہیں ان میں حیات آخرت کو وہ مقام و منزلت حاصل نہیں جو دیگر مذاہب و ادیان کو نصیب ہے، مسیحی مذہب میں حیات آخرت کا تصور اس طرح ہے کہ حیات آخرت کا مقصد و مدعا دنیوی زندگی سے اعلیٰ و برتر ہے، اس لحاظ سے انسان کو یہ خیال کرنا چاہیئے کہ دنیوی لذائذ اور رنگین مظاہر کی حقیقت ایک ظاہر فریب تخیل اور حق ناشناس تصور سے زیادہ نہیں، پھر انسان اپنے دامن کو ان موہوم پرچھائیوں سے بچائے رکھے، تاکہ اس کی روح مادی کثافتوں سے مجرد و مبرا ہو کر بتدریج حیات عقلی کی سرحدیں داخل اور سعادت عظمیٰ سے ہمکنار ہو جائے، ہرچند یہ حقائق و تصورات مسیحی مبلغین کے توسط سے فضائے بسیط میں بار بار نشر ہوتے رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کو اکثر عیسائی تصورات ذہنی شمار کرتے

اور کمال و ارتقائے نفس کا موجب قرار دیتے ہیں، ان تصورات کے ذریعہ کلیسا کی بس یہ آرزو و تمنا ہے کہ انسانی پست طبائع کو اونچی سطح پر پہونچا دے، بنا بریں ایک منکر و منتشر تعلیمات و اعمال کے درمیان بہت زیادہ فرق پایا جاتا ہے جیسا کہ عیسائیوں کے اقوال و افکار اور ان کے افعال و کردار کے مابین بعد المشرقین ہے، ہر چند عیسائی اس نقطۂ فکر کا اظہار نہیں کرتے لیکن ان کے ذہن و خیال میں یہ بات رچی ہوئی ہے کہ ان کے مذہب میں چند تخیلات اس نوع کے موجود ہیں کہ جن کی گہرائیوں تک ان کے عقل و ادراک کی رسائی دشوار ہے، مذہب کے اس مقام کا طلبگار صرف وہی شخص ہوتا ہے جس کو خدا نے خاص ملکوتی صفات و قویٰ سے نوازا ہو؛ اور ان کا خیال و گمان یہ ہوتا ہے کہ مذہبی احکام کی ادائیگی کے لیے صرف یہی کافی ہے کہ ان بالغ حکمتوں، اور سربستہ رازوں کو گوش ہوش سے سن لیں اور یہ اعتقاد کر لیں کہ یہ تمام مذہب کا ایک اہم جزو ہیں، وہ ہر وقت اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ ان اسرار کا انکشاف کریں اور اس بلند و برتر مقام کا نوہ لگائیں، یہ ہے عیسائیوں کا طرز عمل اس دستور کے بارے میں کہ حیات دنیا آخرت کی منزل تک پہونچنے کا ایک راستہ ہے" برگزیدہ اور نیکوکاروں کی سعادت و خوش بختی ایک ایسا راز ہے جو عیسائیوں پر مخفی ہے، یہ بھی ایک عجیب معاملہ ہے کہ سعادت آخرت ہی وہ مرجع و سرچشمہ ہو کہ ہمارے تمام اعمال و حرکات کو اسی منزل مقصود تک پہونچنے کی خاطر سرانجام پانا چاہیئے، لیکن افسوس کہ انسانی عقل و فکر اس بلند مقصد میں سے کسی چیز کا

ادراک کر لینے سے قاصر ہے، ایک اور چیز جو اس مفہوم و مدعا کو اور زیادہ گنجلک اور پیچیدہ کئے دیتی ہے وہ اس نوع اور کیفیت کا عقیدۂ حشر و نشر ہے جو عیسائیوں کے پاس مسلّم ہے، کیونکہ وہ اس کے قائل ہیں کہ اجسام قیامت کے دن مادی جسموں سے روحانی جسموں میں منتقل ہو جاتے ہیں، مقدس پولس کہتا ہے کہ جسم ایک ایسے مادہ سے خلق ہوا ہے جو فنا ہو جاتا ہے اور ایک ایسی کیفیت کے ساتھ دوبارہ زندہ ہوتا ہے جو ناقابل تحلیل و فنا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی جسم حیوانی شکل و صورت میں پیدا ہوا ہے اور پھر یہ جسد روحانی کی شکل میں دوبارہ اُٹھایا جائے گا، لیکن سوال یہ ہے کہ اُن روحانی اجسام کی حقیقت کیا ہوگی جو پھر اجسام ہوں گے اور ارواح ہونے کے ساتھ ساتھ حواس و ادراکات کے حامل بھی، اور اپنے پروردگار کا مشاہدہ کرنے کے قابل بھی، آیا راہبوں اور پادریوں نے ہم سے جس سعادت کا وعدہ کیا ہے یہ وہی تصور ہے اس سعادت کا یا کہ یہ حقیقی سعادت ہے جو تصور و تخیل کی جولاں گاہ سے ماورا جس کا وجود ہے؟ یہ وہ مسائل ہیں جن کے لیے نہ توریت میں اور نہ انجیل میں ایسی صریح نص اور واضح اشارہ ملتا ہے جو اُن مسائل کی توضیح و تفسیر کر سکے۔ آگستان مقدس ہی ایک ایسا پوپ ہے جس کو تمام ارباب کلیسا پر اس بحث میں زیادہ اہمیت حاصل ہے، اس لیے کہ وہ اس سعادت کو سمجھنے میں بے انتہا حریص و دلدادہ تھا، انتہائی چیز جو اُسے حاصل ہوئی یہ ہے کہ وہ اس راز سربستہ کی تفسیر و انکشاف میں قدرت الٰہی اور نصرت ایزدی سے مایوس نہیں ہوا ہے، اُس کی کتاب

کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سعادت افروز روحانی زندگی میں کافی دلچسپی اور شغف رکھتا تھا جس کا تصور خدا کی برگزیدہ ہستیاں کرتی ہیں اور اپنے پروردگار کا قیامت سے پہلے اور اس کے بعد مشاہدہ کیا کرتی ہیں۔ بہر تقدیر و قیاس یہ سعادت ہنوز ایک راز سربستہ اور عقدۂ لاینحل ہے جہاں تک عوام الناس کے عقول و ادراکات کی رسائی ناممکن اور اولیاء و برگزیدہ بندوں کے سوائے اس کا ادراک و انکشاف کسی کے بس کی بات نہیں۔

یہی وہ مقام ہے کہ مسیحی مذہب دو مختلف نقاط نظر رکھنے والے گروہ کے نزاعات و اختلافات کا شکار ہو گیا، ایک گروہ کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ سعادت آخرت ایک نفسانی حالت ہے جس کا مرجع طہارت قلب اور جس کا مرکز مخلوق و خالق کے ابین مشابہت ہے، دوسرے گروہ کا زاویۂ نظر یہ ہے کہ سعادت مستقبلہ ایک مادی امر ہے، سیراستنتے نے ایک کتاب تالیف کی ہے جو تمام ترجدت و بدعت کا مجموعہ ہے، جس کے الفاظ و معانی مشکل اور اس کا مفہوم مبہم اور دھندلا ہے، اس کتاب میں وہ لکھتا ہے کہ "سعادت آخرت سے مراد وہ شادیاں ہیں جیسے کہ دنیا میں واقع ہوں گی" شہر مبورک کا ساتے اور تعلیم جدید کے مذہب کا مجدد جو گزشتہ صدی میں گزرا ہے یہ دعویٰ کرتا ہے کہ آخرت میں تمام لذائذ دنیوی کی نظیریں موجود ہوں گی، اس کا خیال ہے کہ اس بیان سے اس نے مشکلات حل کر دیں اور حقیقت عقبیٰ سے لوگوں کو روشناس کرا دیا ہے، لیکن اس کی کتاب مضحکہ خیز خیالات اور توہین آمیز

عبارات کا مجموعہ ہے۔ اِسی لئے ہم نے اُس کے اقتباسات، خواہ وہ عجوبہ وخرافات ہی کے پہلو سے کیوں نہ ہوں، قارئین کے روبرو پیش نہیں کیئے۔

اِسلام کا تصورِ آخرت

اِسلام نے آخرت اور حیات بعد الممات کا جو تصور پیش کیا ہے وہ مسیحی مذہب کے نقطۂ فکر اور زاویہ نگاہ سے جدا گانہ ہے، ہم مشاہدہ کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کو اِس نعمت وسعادت کا انتظار ہے جس کا پیغمبر اِسلام نے وعدہ کیا ہے اِس لحاظ سے ان کے دل مطمئن ہیں اور دنیا کو آخرت پر قربان نہیں کرتے باقی رہا یہ امر کہ آخرت کی نعمت کس نوع کی ہوگی اور اُخروی سعادت کی کیفیت کیا ہوگی تو اہلِ سنت متکلمین کا اس کے متعلق یہ نظریہ ہے کہ نعمت آخرت ایک ایسی نفسانی حالت ہے جو نفس کو سعادت مندوں اور خوشحال وخوش عیش ہستیوں کے زمرہ میں داخل کرتی ہے، باقی رہا بلند ترین لذتوں کا مشاہدہ کس نوعیت کا ہوگا تو پیغمبر اِسلام نے اہل مشرق کے مدارک واحساسات کے روبرو ان کی بہترین مثالیں پیش کردی ہیں اگر یہ مثالیں نہ ہوتیں تو اُن لذتوں کا تعقل دشوار تھا، اِس لیے کہ مشرقی طبائع معنوی اُمور کے اِدراک سے بہت دُور ہیں، خود اہل مغرب اِس امر معنوی کا اِدراک نہیں کر رہے ہیں، علاوہ ازیں پیغمبر اِسلام نے مسلمانوں کو ایک اور امرِ عظیم کا مکلف گردانا ہے وہ یہ کہ آپ نے اُن کے لیے یہ حرام قرار دیا ہے کہ وہ خالق کائنات کو مخلوق کے پیمانوں سے ناپ کر

دیکھیں، بنا بریں جاندار مخلوق کی تصویر اُن کے لیے حرام ہے، اگر اس کے خلاف احکام دیئے جائے تو لازم آتا کہ اُن کی عقلوں سے ایک ایسی چیز طلب کی جا رہی ہے جو اُن کے لیے ناممکن ہے اور ان کو محض ذہنی لذائذ کے احساس کی تکلیف دی جا رہی ہے یا اُن کے ذہنوں کو تجسیم خدا کے مذہب اور دیگر اوہام باطلہ کی طرف پھیرا جا رہا ہے جو اس تجسیم کا لازمہ ہیں، چنانچہ ان کے سامنے خدا کی ایسی تصویر جو انسانی صورت سے مشابہ ہے اتاری جا رہی ہے کہ وہ اپنے دربار میں جلوہ افروز ہے اور اولیاء و مقربین اس کے اردگرد ہیں، لیکن پیغمبر اسلام نے رمز و اشارہ کی جو صنعت اختیار کی اس تفوق و برتری سے ان تمام مشکلات کو عبور کر لیا۔

ان اللہ لا یستحی ان یضرب مثلاً ما بعوضة فما فوقها فاما الذین آمنوا فیعلمون انه الحق من ربهم واما الذین کفروا فیقولون ماذا اراد اللہ بهذا مثلاً یضل به کثیراً و یهدی به کثیرا وما یضل به الا

ہاں واقعی اللہ تعالیٰ اس بات سے نہیں شرماتا کہ بیان کر دے کوئی مثال بھی خواہ مچھر ہو خواہ اس سے بھی بڑھی ہوئی ہو، سو جو لوگ ایمان لائے ہوئے ہیں خواہ کچھ ہی ہو وہ تو یہی یقین کریں گے کہ بے شک یہ مثال بہت ہی موقع کی ہے اُن کے رب کی جانب سے اور رہ گئے وہ لوگ جو کافر ہو چکے ہیں سو چاہے

فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِؕ

(البقرہ)

کچھ ہی ہو جائے وہ یوں ہی کہتے رہیں گے وہ کون مطلب ہوگا جس کا قصد کیا ہوگا اللہ نے، گمراہ کرتا ہے اللہ اس مثال کی وجہ سے بہتوں کو اور ہدایت کرتے ہیں اس کی وجہ سے بہتوں کو اور گمراہ نہیں کرتا اللہ اس مثال سے کسی کو مگر صرف بے حکمی کرنے والوں کو؛

اگر ہم قرآنِ حکیم کی اُن آیتوں کا مطالعہ کریں جن میں نیکو کاروں کی سعادت و خوش حالی کا تذکرہ ہے تو ہم دیکھیں گے کہ آغاز کار ہی میں ایسے عالی شان باغات کی تعریف و توصیف کی جا رہی ہے جن کو دیکھ کر ہمیں یہ تخیل ہوتا ہے کہ بہشت ہی پُر بہار و زرخیز باغات اور وسیع و شاداب گلزاروں کی طرح ہوگی جو اس دنیا میں موجود ہیں، اور ہم جانتے ہیں کہ عربوں کے نفوس میں یہ اوصاف و خصائص نہایت موثر ہیں، درحقیقت ایک بدوی جو صحرائی خطہ و بنجر زمین میں رہنے اور بدمزہ و بدرنگ پانی پینے کا عادی ہو چکا ہے، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دن بھر اُن چیزوں سے بے بہرہ رہتا ہے، جب یہ تصور کرنے لگتا ہے کہ آخرت میں وہ خوش حال و فارغ البال ہے، سبز و شاداب باغوں اور وسیع مرغزاروں کی گلگشت کا لطف اٹھا رہا ہے، آبِ کوثر سے سیراب ہے اور بہشت میں ہر قسم کا میوہ موجود ہے اور جس سے گوناگوں لذت حاصل ہوتی ہے تو

تو یہ تمام ترغیبات و توصیفات اُس کی زندگی کو خوشگوار بنا دیتے اور اُس کے
دل پر گہرا اثر ڈالتے ہیں، لیکن اِس قسم کی لذت سے صرف وہی شخص لطف
اندوز اور محظوظ ہوگا جس نے دیہات میں زندگی بسر کی ہو اور لق و دق صحرا
میں زندگی کے مصائب کو برداشت کیا ہو، یہی وجہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام
اِس قسم کے لذائذ اور اُخروی نعمتوں کی توصیف مختلف اوقات میں کیا
کرتے تھے، ممکن ہے اِس اعادہ و تکرار سے مغربی عقلیں ان چیزوں کے
عادی نہ ہونے کی وجہ سے اکتا جائیں لیکن یہ سامعین کے نفوس میں جو عرب
تھے، حد درجہ موثر تھا، کیونکہ تکرار و اعادہ کا یہ سلوک فی الواقع مقام خطاب میں
ایک ایسا اسلوب بلیغ تھا جسے بلند مقام حاصل تھا اور ہمیشہ کمال سادگی و
سہولت سے عربوں کی اُمیدوں اور آرزوؤں کو جوش میں لے آتا، اور
اُن کے نفوس میں جد و جہد حیات کے جذبات موجزن کر دیتا تھا، چنانچہ
میں بذاتِ خود مشاہدہ کرتا ہوں اور جب میں اُس وقت کا تصور کرتا ہوں
تو نشۂ لذت میں چور چور ہو جاتا ہوں جب کہ پیغمبرِ اسلام خورشید بیابان کی
جھلساتی ہوئی شعاعوں کے نیچے، جہاں کوئی آسرا اور سائبان نہیں ہے جو
آفتاب کی تمازت و حدت سے محفوظ رکھے، کھڑے ہوئے اپنی قوم کے
سامنے خطبہ دیتے ہیں اور فردوس بریں کے سایہ کو جس کا خدا نے تقویٰ شعار و
سے وعدہ کیا ہے، بیان کرتے ہیں، اور میں اُس وقت ایسی نورانی جماعت
کو دیکھتا ہوں جو کمال اشتیاق و بے تابی کے ساتھ آپ کے اِرد گرد جمع ہے
اور آپ کی شیریں بیانی پر جو رقت انگیز، دلپذیر و دلگداز آواز میں لطافت

باریاں کر رہی ہے فریفتہ و شیفتہ ہو گئے ہیں۔

ولمن خاف مقام ربہ جنتان فبای آلاء ربکما تکذبان ذواتا افنان فبای آلاء ربکما تکذبان فیھما عینان تجریان فبای آلاء ربکما تکذبان فیھما من کل فاکھۃ زوجان فبای آلاء ربکما تکذبان متکئین علی فرش بطائنھا من استبرق وجنا الجنتین دان فبای آلاء ربکما تکذبان۔ (الرحمٰن)	اور جو اپنے پروردگار کی حضور میں کھڑے ہونے سے ڈرا اس کے لیے دو باغ ہیں پھر تم دونوں (اے جن وانس) اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتیں جھٹلاؤ گے؛ وہ باغ طرح طرح کی نعمتوں والے ہیں، پھر تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتیں جھٹلاؤ گے؟ ان دونوں میں دو چشمے بہتے ہیں پھر تم دونو اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتیں جھٹلاؤ گے؟ ان دونو میں ہر میوہ دو دو قسم کا ہوگا، پھر تم دونو اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتیں جھٹلاؤ گے، وہ ایسے فرشوں پر تکیئے لگائے بیٹھے ہوں گے جن کے استر ریشمی ہوں گے اور میوے ان دونوں باغوں کے جھکے ہوئے ہونگے پھر تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتیں جھٹلاؤ گے۔

جس وقت پیغمبر علیہ السلام کوئی آیت تلاوت فرماتے ہیں بہشت کی دلپذیر و دلنشین تعریف کو سن کر حاضرین پر عجیب وجد طاری ہو جاتا ہے اہل مشرق عام طور سے نیکوکاروں کے باغ اور دنیوی باغوں میں تمیز نہیں کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بہشت کی یہ تعریف و توصیف ان کے دل کو بھاتی اور ان کے ہوش و حواس کو اپنی طرف جذب کر لیتی ہے، کیوں کہ یہ ان کے ذوق و وجدان کے ہم آہنگ و موافق ہے اور ان کی عقل و ادراک اسی قسم کے امور سے دلچسپی و شغف رکھتے ہیں، خواہ درحقیقت آنحضرت کا مقصد و مدعا بجز سعادت عقبیٰ کے بیان کے اور کچھ نہ ہو، آسمانی لذائذ کا وصف بھی اسی نوع و نہج کا ہے اور وہ بھی عربوں کے اس رجحان و میلان سے ماخوذ ہے جو اس دنیوی زندگی کے متعلق رکھتے ہیں حسب ذیل آیتوں میں غور کیجئے۔

فیھن خیرات حسان فبای آلاء ربکما تکذبان حور مقصورات فی الخیام فبای آلاء ربکما تکذبان، لم یطمثھن انس قبلھم ولا جان فبای آلاء ربکما تکذبان؛ (الرحمٰن)	ان جنتوں میں نیک سیرت اور خوبصورت عورتیں ہوں گی پھر تم دونوں پروردگار کی کون کونسی نعمتیں جھٹلاؤ گے۔ یعنی حوریں جو خیموں میں چھپی ہوئی ہوں گی پھر تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتیں جھٹلاؤ گے، جن کو ان سے پہلے نہ کسی آدمی نے چھوا ہے اور نہ کسی جن نے

پھر تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتیں جھٹلاؤ گے۔

فاصحاب المیمنة
ما اصحاب المیمنة و
اصحاب المشئمة ما
اصحاب المشئمة
والسابقون السابقون
اولئك المقربون
فی جنات نعیم ثلة من
الاولین وقلیل من الآ
خرین علی سرر موضونة
متكئین علیها متقابلین
یطوف علیهم ولدان
مخلدون باكواب واباریق
وكاس من معین لا یصد
عون عنها ولا ینزفون
وفاكهة مما یتخیرون
ولحم طیر مما یشتهون
وحور عین كامثال اللؤلؤ

پس دائیں طرف والے کیا کہنے دائیں طرف والوں کے، اور بائیں طرف والے، پھوٹ گئے نصیب بائیں طرف والوں کے، اور آگے بڑھنے والے وہ تو آگے ہی بڑھنے والے ہیں۔ نعمت والی جنتوں میں مقرب بارگاہ تو وہی ہیں، یہ پہلوں میں سے بہت سے ہیں اور پچھلوں میں سے تھوڑے سے، سونے کے بنے ہوئے جڑاؤ تختوں پر آمنے سامنے تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے ہمیشہ رہنے والے لڑکے گلاس اور آبخورے اور ایسی شراب کے جام لیئے ہوئے ان کے پاس آتے جاتے رہیں گے جس سے نہ ان کو کبھی درد سر ہوگا اور نہ ان کے ہوش و حواس گم ہونگے اور پھل وہ لائیں گے جن کو یہ

المکنون جزاء بما کانوا
یعملون (الواقعہ)
انا انشاناهن انشاء
فجعلناهن ابکارا عربا
اترابا لاصحاب الیمین
(الواقعہ)

پسند کریں اور پرندوں کا گوشت
ایسا جس کو ان کا جی چاہے، اور
بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں ایسا
جیسے چھپے ہوئے موتی جو نیک عمل
یہ کیا کرتے تھے یہ اس کا عوض ہوگا۔
ہم نے یقیناً اُن کو بالکل نیا پیدا کیا ہے،
پھر ہم نے اُن کو کنواریاں پیار دلانے
والیاں اور ہمسن خاص کر داہنے
ہاتھ والوں کے لیے قرار دیا ہے۔

ان للمتقین مفازا
حدائق واعنابا وکواعب
اترابا وکاسا دهاقا

یہ تمام اشارات و استعارات ہیں اور اُن آیتوں میں جن مادی امور
کا تذکرہ ہے وہ فقط عشق روحانی اور حب الٰہی کا ایک امر ہے، یہ نگارش و
گفتگو کا ایک نہج اور طرز ہے جو مشرقی قوموں کے نزدیک متصور چلا آتا ہے
توریت میں اس قبیل کا اسلوب جا بجا پایا جاتا ہے گویا آسمانی کتابیں میلان
وحب انسانی اور اس کی قوت تاثیر کو استعارہ میں پیش کرتی ہیں تاکہ
آخرت کی نعمتوں کو انسانوں کے لیے ان صفات سے تشبیہ دیں اور
تمثیلی انداز میں اُن کے روبرو پیش کریں یہ امر بھی اس لحاظ سے فطری و

طبعی ہے کہ مرد و زن کا اختلاط ہم جیسے اہل مغرب کے نفوس میں ابدی سعادت کی صورت کو مجسم بنا دیتا ہے، اور مغربی ذوق اس نوع کی تشبیہات و استعارات سے متنفر نہیں ہوتا بشرطیکہ وہ تصریح مطلق کے درجہ پہ نہ پہنچے لیکن مشرقی ذوق ان قیود و شروط کا طلبگار نہیں ہے، اس کے لیے مکمل تشبیہ ہی مناسب ہوگی، لوازم تشبیہ میں سے کوئی عنصر و جزو نظر انداز نہ ہو، اور لوازم و مقتضیات میں کسی قسم کا ابہام و اشتباہ بھی نہ ہونے پائے یہی وہ وسائل و ذرائع ہیں جن کی بدولت مادی احساسات و ادراکات کو خالص ادبیات و روحانیات کے تصور کے لیے ہموار و تیار کیا جا سکتا ہے غلیوم لوریس کی کتاب "قصۂ گل" چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے، جس میں تمام تر تشبیہات و استعارات سے کام لیا گیا ہے، بعض محققین جن میں تقوی کا رنگ پایا جاتا ہے، یہ خیال رکھتے ہیں کہ مولف کتاب جس "گل" سے اپنے بے پناہ جذبۂ عشق کا اظہار کرتا ہے وہ ذات الٰہی ہے نہ کہ کوئی عورت ذات، جو اس کی محبت کا مرکز ہو، یہ کتاب نہایت واضح انداز میں مادیات کی طرف اشارہ کرتی ہے لیکن اس کے باوجود اس کو ارباب نظر ایک مذہبی کتاب شمار کئے ہوئے ہیں، یہاں اس کا موقع نہیں کہ ہم یہ بحث کریں کہ اہل تحقیق قصۂ گل کی جو تفسیر بیان کرتے ہیں وہ صحیح ہے یا نہیں ہماری غرض صرف گذشتہ مطالب کی روشنی میں یہ ظاہر کرنا ہے کہ اہل مشرق کی کتابوں کو ادبی و روحانی تفسیر و تشریح کے قابل شمار کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے خواہ ان کے ظاہری بیانات سے یہ پتہ چلتا ہو کہ ان کا مقصود و مدعا

انہوں مادی ہیں، اِس لحاظ سے عبرانیوں نے اور اُن کے بعد عربوں نے اپنے مقصد کو مادی لذتوں اور جسمانی نعمتوں کے پردوں میں پوشیدہ کر رکھا ہے اُن کا تمام تر مقصد و نصب العین اخلاقیات اور سعادت روحانی ہے جس کی چند جھلکیاں الفاظ میں دکھائی گئی ہیں، اور اشارات میں مراد و کامرانی یا فراق و وصال کی چند ایسی تصویریں اجاگر کی گئی ہیں جن کو سن کر انسانی عقول و اذہان لذت یاب ہوتے ہیں، اِس لحاظ سے بعض اشخاص کے جملوں میں یہ جو آگیا ہے کہ "مجھے آرزو ہے کہ وہ عورت اپنے لبوں سے میرا بوسہ لے" اِس سے میں فی الواقع کسی عورت کی طرف اشارہ مراد نہیں لیتا، اِسی طرح عشق و محبت کے جو الفاظ اور وجد و بے تابی کے جوجذبات و احساسات مزامیر میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں اُن سے اِس کتاب مقدس اور اُس کے تشبیہاتی کتاب ہونے کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں کرتے، بے شک بعض مخصوص بندوں کا خدا کے قریب و نزدیک ہونا ایک ایسا راز ہے جس کا سمجھنا متقدمین عبرانیوں، قدما عرب اور تمام اہل مشرق کی عقلوں سے بالاتر تھا، لیکن یہاں مقصود خدا کے تقرب اور اس کے حضور رسائی حاصل کرنے کے معنی کا سمجھنا نہیں ہے، کیونکہ تقرب خداوندی مستلزم ہے اُن اِستعارات و تشبیہات کی حقیقت کی پہچان کو، بلکہ اُس کی اصلی غرض و غایت یہ ہے کہ یہ تمام رموز ہیں حقائق نہیں، السنۂ مشرقیہ کا مورخ موسیو رینان ہمارے قول کی صحت کا اعتراف کرتا ہے کہ عربوں اور عبرانیوں کے لیے تشبیہات و استعارات کا استعمال اور

الفاظ میں مجازات و کنایات کا بیش از بیش تذکرہ ایک فطری و طبعی امر ہے
جب ہم نے یہ تسلیم کر لیا کہ منزا میر کا مقصد اُن کے ظاہری الفاظ کے مفہوم سے
قطع نظر اُن کا باطنی مطلب ہے اور ان کی لفظی تفسیر و تشریح جائز نہیں ہے
تو ہم پر یہ امر لازم ہو جاتا ہے کہ اُن قرآنی آیات کے سمجھنے میں جن میں بہشت
کا تذکرہ اور اُخروی نعمتوں کا بیان موجود ہے بعینہٖ یہی طریقہ ہمیں اختیار کرنا
چاہیئے، ہاں ہمارے لیے یہ دشوار ہے کہ ہم اُن خالص مادی تصویروں
کے پس پردہ روحانی و ادبی مقاصد کا مشاہدہ کریں لیکن یہ صعوبت و مشکل
اس لحاظ سے ہے کہ قرآن میں جس نوعیت و ترتیب سے اُن کا استعمال ہوا ہے،
وہ اُن چیزوں سے مخالفت رکھتا ہے جن کے ہم اپنے اقوال اور اپنی کتابوں
میں عادی ہو چکے ہیں، لیکن کسی فرد ملت کے لیے یہ جان لینا نہایت سہل
ہے کہ اپنے اور غیر قوم کے ایک فرد کے طریقۂ تفہیم و تفاہم اور طرز گفتگو کے
درمیان بہت فرق ہے، جس مطلب کو ہم لطافت و رقت سے اشارہ
کر دینا کافی سمجھتے ہیں مشرقی اُس کو حقیقی صورت میں ظاہر کر دیتا ہے اور
ہماری عقلوں کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رکھتا کہ ہم الفاظ کے درمیان سے
اس کا مشاہدہ کر لیں ؟

ہمارے لیے یہ سمجھنا دشوار ہے کہ جس وقت ایک مسلمان قرآن کی
تلاوت کرتا ہے اس کے دل پر ان دو معنی میں سے کونسا معنی منقش و مرتسم
ہو جاتا ہے لفظی معنی یا حقیقی معنی، ممکن ہے کہ جن اشخاص کی عقل کمزور ہو وہ
ظاہری الفاظ کے معنی و مفہوم کے سوائے کوئی اور معنی نہ سمجھتے ہوں، لیکن

صاحب دل اور ارباب نظر لفظ میں ایسے معنی جلوہ گر دیکھتے ہیں جو ان کو بلند مقاصد کی طرف مائل کر دیتے ہیں اور وہ ان معانی میں بندہ و خالق کے درمیان تقرب کا لطف اٹھاتے ہیں، بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو قرآن کو سنتے ہیں اور اس کے ظاہری کلمات کے معتقد نہیں ہیں بلکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ قرآن کا مقصد ایک مخصوص سعادت ہے اور اس سعادت کا وہ ایسی کیفیت کے ساتھ تصور کرتے ہیں جس کے تمام گوشے ان کے سامنے واضح و روشن نہیں ہیں، علاوہ بریں قرآن مجید میں سعادت اخروی کے باب میں بلاتشبیہ و استعارات بے شمار آیات موجود ہیں، اس بناء پر کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ قرآن نے مسلمانوں سے جس سعادت و نعمت کا وعدہ کیا ہے مسلمان اس سے صرف مادی لذائذ مراد لیتے ہیں، اس قسم کا دعویٰ وہی شخص کر سکتا ہے جس کی نظر سے قرآن حکیم کی یہ آیات اوجھل ہوں اور اس کا منشا یہ ہو کہ قرآن کے اصل مطالب کو بدل دے اور اس کے حقائق ثابتہ میں تغیر و تبدل کر دے۔

وعد اللہ المومنین والمؤمنات جنات تجری من تحتها الانهار خالدین فیها ومساکین طیبة فی جنات عدن ورضوان من اللہ اکبر ذلک هو الفوز العظیم ۵	اللہ نے مومن مرد اور مومن عورتوں سے ایسی جنتوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی اور ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہونگے اور دائمی بہشتوں میں اچھے اچھے مکانوں کا بھی وعدہ کیا ہے اور اللہ کی

(التوبہ) | خوشنودی سب سے بڑھ کر ہے یہی تو بڑی کامیابی ہے۔

مفسرین رضوان اللہ کے معنی یہ بیان کرتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ اپنے برگزیدہ ومقرب بندوں پر اپنی تجلی کرے گا، اُن کی سعادت کی تکمیل اور نعمت خداوندی کا اُن پر اتمام ہو جائے گا چنانچہ قرآن حکیم میں اِس طرح اِس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔

دعواهم فیها سبحانك اللهم وتحیتهم فیها سلام وآخر دعواهم ان الحمد لله رب العالمین۔

(یونس)

ان کی دعاء ان جنتوں میں یہ ہوگی کہ اے اللہ تو پاک ہے اور اُن کی صاحب سلامت اُس میں سلام ہوگی اور ان کی ختم دعاء یہ ہوگی کہ ہر قسم کی تعریف تمام عالموں کے پروردگار کے لیے ہے۔

والذین صبروا ابتغاء وجه ربهم واقاموا الصلوٰة وانفقوا مما رزقناهم سرا وعلانیة ویدرؤن بالحسنة السیئة اولئك لهم عقبی الدار۔

(رعد)

جن لوگوں نے اپنے پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے صبر کیا اور نماز پڑھی اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا تھا اُس میں سے چھپا کر اور ظاہر طور پر (راہِ خدا میں) خرچ کیا اور بدی کا بدلہ نیکی سے کرتے رہے عاقبت کا گھر اُنہی کے لیے ہے۔

زین للناس حب الشھوات	آراستہ کی گئی ہیں لوگوں کے لیئے
من النساء والبنین والقناطیر	خواہشیں عورتوں کی اور بیٹوں کی،
المقنطرۃ من الذھب	اور سونے اور چاندی کے ڈھیر کے
والفضۃ والخیل المسومۃ	ڈھیر اور نشان زدہ خوبصورت
والانعام والحرث ذلک	گھوڑے اور مویشی اور کھیت،
متاع الحیوۃ الدنیا واللہ	یہ تمام دنیوی زندگی کا سازوسامان
عندہ حسن الماب ۃ	ہے اور اللہ کے پاس بہترین ٹھکانا
(آل عمران)	ہے۔

اس کے باوجود قرآن نے خود معترضین کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی اور اس امر سے منع کیا ہے کہ لوگ قرآنی آیات کی لفظی تفسیر بیان کریں یا تشبیہ کو اس رنگ میں مجسم کرلیں جو مقام قرآنی کے مناسب نہیں، سورہ آل عمران میں فرمایا گیا ہے۔

ھوالذین انزل	وہ وہی تو ہے جس نے تم پر کتاب
علیک الکتاب منہ آیات	نازل کی جس کی کچھ آیتیں تو صاف
محکمات ھن ام الکتاب	صاف ہیں اور وہی کتاب کی اصل
واخر متشابہات	ہیں اور کچھ گول گول ہیں، اب جن
فاما الذین فی قلوبھم	لوگوں کے دلوں میں کھوٹ ہے
زیغ فیتبعون ما تشابہ	وہ فتنہ پھیلانے کی نیت سے اور
منہ ابتغاء تاویلہ	اپنا مطلب نکالنے کی غرض سے

وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم یقولون آمنا بہ کل من عند ربنا وما یذکر الا اولوا الالباب ۝

(آل عمران)

اُن گول گوں آیتوں کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ ان کا اصلی مطلب سوائے خدا اور اُن لوگوں کے جو علم میں مضبوط ہیں اور کوئی نہیں جانتا وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم اُس پر ایمان لائے ہر ایک (محکم و متشابہ) ہمارے رب کی طرف سے ہے اور سوائے صاحبان عقل کے اُس سے اور کوئی نصیحت نہیں حاصل کرتا۔

وان منھم لفریقا یلون السنتھم بالکتاب لتحسبوہ من الکتاب وماھو من الکتاب ویقولون ھو من عند اللہ وما ھو من عند اللہ ویقولون علی اللہ الکذب وھم یعلمون۔

(آلِ عمران)

اور بے شک ان میں سے ایک گروہ ایسا ہے کہ وہ (تلاوت) کتاب میں اپنی زبانوں کو اِس طرح موڑتا ہے کہ تم اُس کو کتاب کا جزو خیال کرلو حالانکہ وہ کتاب نہیں ہے اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے ہے اور حالانکہ وہ اللہ کے پاس سے نہیں ہے اور وہ جان بوجھ کر اللہ پر بہتان باندھتے ہیں۔

مسلمان متکلمین جو تفسیر قرآن میں درک و انہماک رکھتے ہیں۔ بالخصوص اہل سنت جو تفسیر میں احادیث نبوی اور اقوال و آثار سلف صالحین کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اسباب نزول پر نظر رکھتے ہیں اِس امر پر متفق ہیں کہ سعادت آخروی ایک امر ذہنی ہے قائم بالنفس اور نفس اس سے متمتع و بہرہ یاب ہوتا ہے، یہ نعمت و سعادت تمام نعمتوں اور سعادتوں سے عظیم ترین ہے، اس کے ماوراء و مافوق اور کوئی نعمت نہیں ہے، ایک بڑے عالم کا قول ہے " پروردگارا! مجھے بہشت کی آرزو صرف اِس لیے ہے کہ تیرا دیدار وہاں نصیب ہوگا اور تیرے جلووں کی وہاں بارش ہوگی، اگر تیری مقدس و روشن ترین ذات کا وہاں نور اور جلوہ نہ ہو تو میں ایسی بہشت سے کنارہ کش ہوتا ہوں؟

میں اِس باب کو شیخ قشیری کی دعائے ماثورہ سے ختم کرتا ہوں جو غالباً عیسائیوں کی دعائیہ کتابوں سے کم نہ ہوگی۔

" بار الٰہ! تو مجھے ایسے فراق کی تہدید کرتا ہے
جو مجھے ہمیشہ تیری نورانی تجلیات سے محروم
کر دے، پروردگار! تجھے جو منظور ہے
وہ کر، لیکن مجھے تیرے مشاہدۂ نورانی سے
محروم نہ کر، کیونکہ اِس غم و اندوہ فراق سے
بڑھ کر کوئی زہر قاتل و تلخناک نہیں، روح کا

اِتصال اگر اپنے خالق کے ساتھ نہ ہو تو وہ ایسی زندگی کو لے کر کیا کرے گی جو سراپا خوف و دہشت ہو اور اُسے ایسی بقا کیا راس آئے گی جو سراسر حیرت و اضطراب میں غوطہ زن ہو؟ خدایا! میرا نفس اس کے لیے رضامند ہے کہ سو مرتبہ موت کا مزہ چکھے لیکن وہ یہہ گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں کہ تجھ سے ایک مرتبہ بھی جدا ہو۔

خداوندا! اگر میں تمام حوادث روزگار کا نشانہ اور جملہ مہلک امراض کا شکار ہو جاؤں تو اپنے ماتھے پر غم و اندوہ کی ہلکی سی شکن بھی ڈالے بغیر اُن کو برداشت کر لوں گا، مگر تیری جُدائی اور دوری کو برداشت کرنے کی میرے اندر طاقت و توانائی نہیں۔ پروردگارا! اگر ایک پل بھی تو محجوب ہو جائے تو ہماری زمینیں بنجر اور نہریں خشک ہو جائیں لیکن اس وقت کا کیا حال ہوگا جب کہ تیرا یہ احتجاب دوامی ہو؟ اگر تو مجھ سے دور ہو تو آتشِ جہنم میرے حق میں گلزار اور اس کے بھڑکتے ہوئے شعلے میرے لیے

لالہ و گلاب ہیں، پروردگار! تیری تجلی میں ہماری
حیات اور ہماری کمال سعادت و نعمت ہے،
اور تیرا احتجاب ہمارے لیے عذاب جہنم
سے بڑھ کر ہے۔"

باب پنجم
قضاء و قدر

متشابہات قرآن اور مذہب ناسخ و منسوخ

لوگ ہر بحث کو قرآن سے ثابت کرتے ہیں

کیوں کہ قرآن مجید میں اہلِ نظر اور ارباب بحث کے لیے یہ بہت ہی آسان امر ہے کہ اپنے متضاد دعاوی کے لیے کوئی سند اور شہادت پیدا کر لیں، اس بارے میں قرآن دیگر تمام کتب مقدسہ سے کوئی امتیاز نہیں رکھتا کہ ایک مبصر ان کے اپنی ظواہر متشابہات پر توقف کرے، قرآن مذہب اہل سنت کی رو سے قدیم ہے، روز ازل سے لوح محفوظ میں مرقوم ہوا فرشتہ جبرئیل ع نے اس کو ماہ رمضان کی ۲۸ دیں شب کو جو شب قدر ہے، ساتویں آسمان سے چوتھے آسمان پر نازل کیا، اس کے بعد ۲۳ سال کی مدت میں جو رسالت کی مدت ہے، پیغمبر اسلام پر نازل ہوا؛ ہمارے خیال میں اس روایت کو صرف ایک صورت میں قبول کیا جا سکتا ہے

اور وہ صورت یہ ہے کہ چھ ہزار آیتیں جن سے قرآنِ مجید ترکیب پذیر ہے، یکے بعد دیگرے بدوں اس قید کے نازل ہوئی ہیں کہ پہلی مرتبہ نازل ہونیوالی آیتوں کی تعداد دوسری دفعہ کی آیتوں کی تعداد کے مساوی ہوں، نیز یہ آیات مختلف احوال وظروف اور مختلف اوقات میں نازل ہوئی ہیں، بنابریں ایک محقق و باحث کو نزولِ آیات کے احوال و ظروف کو سمجھنا چاہیے تاکہ وہ متشابہات آیات میں غور و نظر کر سکے، انجیل انسانوں کے روبرو حیاتِ رسول کے جمیع ادوار اور اس کی تمام تعلیمات کو تفصیل سے واضح عبارت میں ذکر کرتی ہے، اس لیے عیسائیوں کے لیے شروع ہی سے یہ سہل کر دیا گیا ہے کہ انجیل کے ان باہمی مقامات کو نقل کریں، لیکن قرآن میں اس معاملہ میں کوئی تذکرہ نہیں ہے بجز اس کے کہ وہ خدا کا کلام ہے جو پیغمبر پہ اتارا گیا ہے، اور یہ کہ فلاں سورہ مکی ہے اور فلاں سورہ مدنی، کوئی اور چیز بیان نہیں کرتا ہے، یہ تقسیم اختیاری تقسیم ہے جو جمع قرآن کے زمانے میں داخل ہوئی، قرآن میں کوئی ایسی تشریح یا خبر نہیں ہے جو ان حوادث و واقعات اور احوال و ظروف کے پہچاننے میں امداد بہم پہونچائے جو قرآن کی آیتوں اور سورتوں کے نزول کا موجب ہوں، یہ اُن اسباب میں سے ایک سبب ہے جو اس قول کی پیدا وار ہے کہ قرآن میں اختلاف ہے، یہاں اختلاف کے لیے ایک اور سبب ہے جو قابلِ قبول ہو سکتا ہے وہ سبب یہ ہے کہ افکار و خیالات کے حال کے مطابق اور ان تحولاتِ دینی کے موافق جو رسالتِ آنحضرتؐ کے واسطہ سے افکار و معتقدات میں پیدا

ہو جاتے تھے، پیغمبر اسلام پر وحی نازل ہوتی تھی اور ان احوال و ظروف کے
مقتضا، و آیتیں نازل ہوتی تھیں، طبعی طور پر یہ امر لازمی تھا کہ آیات لاحقہ
میں تبدیل ہو جائے تاکہ وہ موقع و مقام کے مناسب و ہم آہنگ ہو جائیں
بنابریں جو حکم وحی کے ذریعہ دینِ جدید کے خلاف کسی شک و شبہ کی تردید
کے لیے صادر کیا گیا تھا ممکن نہیں ہے کہ یہ حکم احوال و ظروف کے تبدل و
تغیر اور انکار و اذہان سے اس سبب کے زوال کے بعد اپنی پہلی ہی حالت
پر برقرار رہے، اگر طبیب مرض کے ادوار و درجات کے مطابق مختلف
دوائیں تجویز کرے تو کوئی شخص اس پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا، جو لوگ
اس باب میں قرآن پر نکتہ چینی کرتے ہیں ان کے اعتراضات اور نکتہ چینیوں
کو علمائے اسلام مذہب ناسخ و منسوخ سے رد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ
خدائے تعالیٰ نے چند احکام قرآن میں نازل فرمائے اور اس کے بعد بواسطہ
اسباب اور بتقاضائے حکمت ان احکام کو دوسری آیتوں کے ذریعہ
منسوخ کر دیا۔

متشابہات قرآن کی دو قسمیں ہیں، ایک خالص ظاہری تقسیم
جو احکام متشابہات کے درمیان موافقت پیدا کر سکتی ہے، ایک اور
قسم ہے جس کا سبب مخفی ہے یا اس کا سمجھنا دشوار ہے بالخصوص وہ
جس کا تعلق قضائے مبرم سے ہے، یہی وجہ ہے کہ اس قسم میں گفتگو کرتے
وقت علما و متکلمین کے ذہن و تخیل کی جولان گاہیں تنگ ہو گئی ہیں، قرآن
میں اس موضوع کے متعلق جو اشارے پائے جاتے ہیں وہ احادیث

شریفہ میں وارد شدہ مباحث کے مقابل بہت کم ہیں، احادیث کی اس قدر بڑی ضخیم جلدیں موجود ہیں کہ وہ قرآن کے مقابلہ میں قوانین، کلیسا کے مطابق ہیں، اور ان احادیث کا حکم تقریباً انہی قوانین کے حکم کے موافق ہے لیکن احادیث کا درجہ مسلمانوں کے نزدیک قرآن کے درجۂ اعتبار کے برابر نہیں ہے، جن اشخاص نے احادیث کو جمع کرنے کی کوشش کی انھوں نے انکو مختلف مقامات سے... حاصل کر کے اکٹھا کرنے میں بڑی جدوجہد اور اہتمام کیا ہے لیکن جمع احادیث پیغمبر علیہ السلام کے دو سو سال بعد حاصل ہوئی یہی وجہ ہے کہ اہل بحث و تحقیق ان احادیث کی صحت کا اس درجہ اطمینان نہیں رکھتے جس قدر کہ قرآن کی صحت و درستگی پر ان کو یقین و اذعان حاصل ہے، یہ امر بعید از قیاس نہیں کہ بعض متکلمین پیغمبر کے متعلق خوش عقیدہ ہوں اور بہت سی ایسی احادیث جو پیغمبر علیہ السلام کی طرف سے منسوب ہیں آنحضرتؐ سے وارد نہ ہوئی ہوں۔

جبر و اختیار اور قضا و قدر قرآن و حدیث میں مذکورۂ بالا بیان کی روشنی میں

بعض متکلمین کے لئے آسان ہو گیا ہے کہ بعض قرآنی آیات اور بالخصوص بے شمار احادیث سے یہ نتیجہ نکالیں کہ قضا و قدر کو تسلیم کرنا اصول اسلام میں سے ایک اصل اور یہ عقیدہ رکھنا کہ انسان کو اپنے افعال و اعمال میں کوئی اختیار حاصل نہیں ارکان دین میں سے

ایک رکن ہے، لیکن میں بآسانی یہ جانتا ہوں کہ ایک محقق و مبصر اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کہ دین اسلام انسان کے افعال اختیاری کے ساتھ کوئی منافات و تضاد نہیں رکھتا، قرآن و حدیث سے سند و شہادت پیدا کر لیتا ہے، اس کے باوجود یہ مسئلہ کتب مقدسہ کے مسائل میں سے ایسا مسئلہ ہے جو ہنوز متکلمین کی نگاہوں کا مرکز اور بحث و نظر کا محور رہا ہے، اور آج تک اس عقدہ لاینحل کو حل کرنے کی کوئی صورت انھوں نے نہیں پیدا کی ہے، کائنات کی ہر چیز کے متعلق خالق ارض و سماوات کی قدرت و فعالیت اور انسان کے اختیار کے درمیان موافقت و توازن پیدا کر دینے کا سوال ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں مسلمان اور عیسائی دونوں شریک ہیں اور ان میں سے ہر گروہ کے آراء و نظریات) میں آج تک اختلاف و مناقشہ برپا ہے۔

پیغمبر علیہ السلام نے اپنے خالق کا وصف اس طرح کیا ہے کہ وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے، اس کے بعد یہ صفت بیان کی ہے کہ وہ علام الغیوب ہے، یہ دوسری صفت وصف اول کا ایک جزو ہے نیز آپ نے ذات الٰہی کی قدرت کاملہ کی بھی توصیف کر دی ہے، اس سے مخلوق کی تبعیت کا نتیجہ اخذ کر کے کہا ہے کہ خدا ہی ہر شئے کے لیے اوّلین سبب اعظم ہے، اس بنا پر ہمارے تمام اعمال کا سرچشمہ ذات خداوندی کو قرار دیا ہے، قرآن میں جا بجا متعدد مقامات پر اسی پہلو پر وھو القاھر فوق عبادہ (وہی اپنے تمام بندوں پر

غالب ہے) عالم الغیب والشھادۃ (غیب و شہود کی تمام
چیزوں کو جاننے والا ہے) اور قل کل من عند اللہ ۔
کہہ دیجئے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے)
کے ذریعہ روشنی ڈالی گئی ہے، یہ تمام وہ حقائق ہیں کہ فریقین کے مختلف
نقاطِ نظر کا مدار انہی پر ہے، انسانی اختیار کے دعویداروں کی تائید
بھی قرآن کے بیشتر مقامات سے ہوتی ہے، مفسرین نے ۱۵ ایسی
آیتیں شمار کی ہیں جو تمام تر اثبات ارادہ و اختیار میں آئی ہیں، اس کے
علاوہ تیرہ آیتیں اور بھی ہیں جو انسانی عمل و کردار میں انسان کی مسئولیت
کے ساتھ مخصوص ہیں، ہمیں یہ توقع ہے کہ پیغمبرِ اسلام ان دونوں نظریات
کے مابین موافقت پیدا کرنے کے لیے ایک ایسی چیز پیش فرماتے تھے
جس کو ہم آہنگ کرنے کی طرف قرآن مجید کے علاوہ کتب مقدسہ نے
توجہ نہیں کی، علماء و متکلمین نے ان دو حقائق کے مابین مطابقت
پیدا کرنے کی جو جد و جہد کی ہے اس کا حاصل سوائے غلط بحث اور
معرکہ آرائی کو زیادہ کرنے کے اور کچھ نہیں ہے، یہاں ایک راز کا مقام
ہے جہاں تک عقل و فہم کی رسائی نہیں ہوئی، موسیو بوسویہ نے اپنی
کتاب "اختیار" میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے جہاں وہ کہتا ہے کہ
"ایک حقیقت کبھی دوسری حقیقت کو تباہ نہیں کرتی، دو حقیقتوں
کے درمیان توازن و یکسانیت پیدا کرنا انسانی عقل و فہم کی دسترس
سے باہر ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر ایک حقیقت کی صحت کا عقیدہ

نہ رکھا جائے' اس لحاظ سے قدرتِ الہیہ کے ثبوت کے ذریعہ انسانی ارادہ واختیار کی نفی کرنا یا انسان کے اندر وجود اختیار کے واسطہ سے قدرت الہیہ کی نفی کرنا محال ہے' اس لیئے کہ یہ دونوں ایسی دو حقیقتیں ہیں کہ جن میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں"۔ بوسویہ کا نظریہ یہ تھا کہ افہام بشری اس کو سمجھنے کی طاقت) نہیں رکھتے' چنانچہ جو اشخاص اس مسئلہ کے قریب ہو جاتے تھے اُن کو موسیو یہ ہدایت کرتا تھا کہ بقدر امکان زنجیر کی دونوں کڑیوں پر نظر رکھیں خواہ حدِ اوسط یعنی درمیانی کڑی ایسی چیز پیدا نہ کرتی ہو جو دونوں کڑیوں کے اتصال کی کیفیت کو سمجھ جائیں' یہ دونوں کڑیاں جن میں سے کوئی بھی نظر انداز کی جانے کے قابل نہیں' قدرت الٰہی اور آزادی انسان ہے یعنی اختیار وحدِ اوسط جو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہے الٰہی دو امور کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتا ہے' لہذا ہمیں خالق کی کارسازی کا علم نہیں کہ وہ اپنی اس کارسازی کے ساتھ انسانی اختیار کو بھی نگاہ میں رکھتا ہے' نیز ہم ازلی قدیم سببِ کلی سے واقف نہیں کہ کس طرح وہ ثانوی سببِ حادث کو نظر انداز نہیں کرتا' موسیو بوسویہ کہتا ہے کہ "یہ راز تو خدا ہی بہتر جانتا ہے' ہمیں اس میں دخل دینے اور چون وچرا کرنے کی اجازت نہیں ہے" اور اس راز کا خدا کے نزدیک راز ہی باقی رہنا ہمارے لیئے کوئی ضرر رساں نہیں"۔ موسیو بوسویہ کا یہ نظریہ وہی ہے جو اس موضوع میں مسلمانوں کا حقیقی مطمح نظر اور مسلک ہے پس اگر آپ مسلمانوں سے یہ سوال کریں کہ تم قدرتِ خدا اور اختیار انسان

میں کس طرح توازن وہم آہنگی پیدا کرتے ہو تو مسلمان فوراً جواب دیں گے کہ اس حقیقت کا علم خدا ہی کو ہے جیسا کہ موسیو بوسویہ نے کہا ہے، یا وہ یہ کہیں گے کہ خدا جس چیز کا ارادہ کرتا ہے کسی شخص کو اس میں بحث وجستجو کرنے کی ضرورت نہیں ہے یہ خدا ہی کو سزاوار ہے کہ وہ اپنے ارادہ ونشاء کے مطابق اپنے بندوں سے بازپرس اور سوال کرے، قرآن میں اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون یعنی

اس کے کسی فعل کی بابت کوئی سوال نہیں کیا جائے گا بلکہ خود انسان سے ان کے اعمال وکردار کے متعلق بازپرس کی جائے گی۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ قضا و قدر میں مسلمانوں کا کس قدر اعتقاد ہے، اس کے بعد بعض متکلمین علماء اسلام قضا و قدر کے قائل اور باقی علماء نظریہ جبریہ کا ربند ہیں، انھوں نے اختیار و ارادہ انسانی کی نفی اس لیے کی ہے کہ کار گاہ جہان میں قدرت خداوندی اور اسکی انفرادیت میں کوئی معارضہ پیدا نہ کر دیں، بعض متکلمین نے اس مشکل مسئلہ کا حل اس مسلک کے خلاف نظریہ رکھنے میں سمجھا ہے، یہ لوگ اصحاب اختیار (قدریہ) سے نامزد ہیں۔ پس جہاں جبریہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ تمام اعمال انسانی ذات خدا سے صادر ہوتے ہیں، ہاں قدریہ کا یہ نظریہ ہے کہ انسان اپنے تمام اعمال کا خود خالق ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ بالجرافن نے مذہب قضا و قدر پر طعن وقدح کے

دَوران میں جو روایت پیغمبر سے کی ہے وہ جبریہ میں سے کسی ایک کا قول ہے جو آنحضرت علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے اور حدیث نبوی نہیں ہو سکتا، حدیث یہ ہے کہ جب خدا نے انسان کو پیدا کرنا چاہا تو مٹی کو جس سے انسان پیدا ہوا ہے، اپنی دونوں مٹھیوں میں اُٹھا لیا اور دو مساوی حصّوں میں تقسیم کر کے کہا یہ بہشت کا سرمایہ ہے اور مجھے اس کی کوئی پروا نہیں، اور یہ حصہ دوزخ کا مال ہے اور مجھے کوئی پروا نہیں"۔ اس موضوع حدیث کو نقل کر کے بالجراف نے تمام انگریز مستشرقین کی طرح اسلام پر حملہ کیا ہے اور اسلام پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ یہ بندگانِ قوت اور پرستارانِ طاقت کا دین ہے اس لیے کہ مسلمانوں کا خدا ایسا خدا ہے تمام اعمال و افعال خاص اس کے دستِ قدرت میں ہیں، ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ممکن ہے کہ کوئی توحید پرست عالم مسلمانوں کے درمیان اِس روایت سے استدلال کرتے ہوئے جس کی صحت پر محدثین کا اتفاق نہیں ہے، یہ دعویٰ کرے کہ جنت و دوزخ ازل ہی سے تقدیر میں لکھ دیئے گئے ہیں، لیکن ہم علماء و محققین سے جو حقائق امور میں بحث و نظر کرتے اور کلیات میں تدقیق و جستجو کرتے ہیں یہ طریق کار اختیار کرنے کے کبھی رَوادار نہیں، اس بنا پر ہمارے لیے یہ سہل ہو جاتا ہے کہ بالجراف کے اِس قول کو قبول کریں کہ دینِ اسلام ہر چیز کو قدرت خالق کی طرف رجوع کرتا ہے، مگر ہم علاوہ بریں کہ آنحضرت بندگانِ قوت میں سے نہ تھے، جبریہ کے مذہب کو تسلیم نہیں کرتے اِس لیے کہ آپ ہر چیز کا سببِ اوّل خدا ہی کو قرار دیتے ہیں

عن قریب ہم بیان کریں گے کہ آنحضرتؐ کا مذہب اس گروہ کے قول کے مطابق ہے جن کی بحث و جستجو مسیحی علماء کے درمیان بہت بلند مقام رکھتی ہے اور اس گروہ کی رائے کو کسی نے مورد طعن و تشنیع نہیں ٹھرایا، اور کسی محقق و مفکر نے اس کے مذہب پر کوئی رد و قدح نہیں کی، اسلام ان ادیان و مذاہب میں سے نہیں جو ہر چیز کو قوت کی طرف رجوع کرتے ہیں، بلکہ یہ سب سے پہلا دین ہے جس نے کمال وضاحت و صراحت سے مخلوق و خالق کے درمیان امتیازی حدود مقرر کئے ہیں، اس لحاظ سے اسلامی شریعت سے الوہیتہ طبیعیہ کا دعویٰ کرنا حقیقت سے کس قدر دور ہے آنحضرت علیہ السلام نے ان تمام چیزوں کو جو صفات الوہیت سے تعلق نہیں رکھتیں شان الوہیت کے دائرہ سے خارج کر دیا، یہ کہنا بھی آپ کی شان سے بعید ہے کہ خدا ہی ہر چیز ہے، دوسری طرف اگر ہم اہل مشرق کے افکار و اذہان کی طبعی خصوصیات کی طرف رجوع کریں تو دیکھیں گے کہ یہ فطرت پرستوں کے مذہب کے موافق نہیں ہیں، اس قسم کا رجحان و میلان تو عجمیوں کی طرف سے پیدا کر دیا گیا ہے جنھوں نے بے شمار مسائل اور بے حساب غلط فہمیوں کو اسلام کے اندر داخل کر دیا یہاں تک کہ اسلام کو اس کے اصلی مزاج اور طبعی خاصیت سے منحرف کر دیا۔

سالس امام بخاری رح سے ایک حدیث نقل کرتا ہے کہ اس حدیث کا مفہوم اس مذہب کے اثبات پر دلیل ہوتا ہے جس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک نعمت آخروی ازل ہی میں مقدر ہو گئی ہے، مخفی

نہیں کہ امام بخاری جبریہ سے تھے جن کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ انسان کے تمام اعمال کا خالق خدا ہے اور انسان کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے، اس لئے جو روایت نقل کی ہے وہ یہ ہے:-

"حضرت موسیٰؑ و حضرت آدمؑ عرش خداوندی کے آگے رو برو کھڑے ہو گئے موسیٰؑ نے کہا کیا آپ وہی آدمؑ نہیں کہ خدا نے آپ کو پیدا کیا اور آپ کے اندر روح پھونکی، فرشتوں کو حکم دیا کہ آپ کے سامنے سجدہ کریں، بہشت میں آپ کو جگہ دی، اس کے بعد آپ کی نافرمانی کی وجہ سے بہشت سے انسانوں کو محروم کر دیا، حضرت آدمؑ نے جواب میں کہا کہ تم وہ موسیٰ ہو کہ خدا نے تمہیں اپنی رسالت سے سرفراز فرمایا، اپنے اوامر و احکام کا تم کو امین گردانا، الواح شریعت تم پر نازل کیں اور تم کو اپنی ہمکلامی کا شرف عطا کیا، کیا تم جانتے ہو کہ میرے پیدا ہونے سے کتنے سال قبل الواح شریعت تحریر کئے گئے ہیں، موسیٰ نے کہا چالیس سال قبل، آدم بولے کیا تم نے اس شریعت میں نہیں پڑھا "وعصیٰ آدم ربہ فغویٰ" اور آدم نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی اور بھٹک گئے۔"

موسیٰ نے جواب دیا بے شک میں پڑھ چکا ہوں
آدم نے فرمایا مجھے تم اس لیے نشانۂ ملامت
ٹھہراتے ہو کہ میں نے ایک ایسی چیز کی بجاآئی کی
جس کو خدا نے مجھے پیدا کرنے سے چالیس سال
قبل اور آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق سے پچاس
ہزار سال پیشتر میرے مقدر میں لکھ چکا تھا کہ
میں اس کا ارتکاب کروں گا۔"

اگر ہمیں یہ معلوم ہو جاتا کہ عرش الٰہی کے سامنے آدم و موسیٰ میں سے کون ایک دوسرے پر غالب آئے تو بآسانی اس امر کا حکم لگا سکتے کہ اختیار انسان میں موجود ہے یا نہیں، امام بخاری رح کہتے ہیں کہ بہت سے صحابہ نے پیغمبر علیہ السلام سے دریافت کیا کہ ان میں سے کون غالب ہوئے، آخر کار آنحضرتؐ نے فرمایا آدم غالب آئے، امام بخاری رح کا یہ بیان بدون کسی توضیح کے ایک دعویٰ کی تائید میں ہے، حالانکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ خبر جبلی ہے، اور جبریہ میں سے کسی نے اپنے مسلک اور نقطۂ فکر کی تائید کے لیے اس کو گھڑ لیا ہے، اسی لیے اصحاب اختیار میں سے ایک نے کہا ہے کہ اس مناظرہ میں موسیٰ کو کامیابی ہوئی، اور پیغمبر علیہ السلام نے جواب دیا کہ غلبہ موسیٰ کو ہوا تھا، ان دونوں حدیثوں سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ فریقین کے درمیان محل نظر و موضوع بحث بنا ہوا ہے، اور واقعہ بھی یہی ہے کیونکہ ایسے احوال ظروف اور قرائن و آثار ہمارے نزدیک

موجود ہیں کہ جو اس امر پہ دلالت کرتے ہیں کہ پیغمبرِ اسلام اس مسئلہ میں غور وخوض کرنے کو ناپسند سمجھتے اور اس موضوع کے متعلق سوال کرنے کو معیوب جانتے تھے، گفتگو کے خصوصی مواقع پر وحی کے ذریعہ جو مبہم امور آپ پر نازل ہوئے تھے ان کی تفسیر سے اجتناب فرماتے اور آپ کی زبانی یہ ارشاد ہوا ہے، اذا جاء ذکر القدر فامسکوا یعنی جب تقدیر کا ذکر آجائے تو تم اس کے متعلق چہ میگوئیاں کرنے سے باز رہو۔

مذکورہ بالا بیان کی روشنی میں یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ ابوالبشر پہ عقیدۂ جبر کا الزام عائد کرنے کے متعلق اپنا نقطۂ خیال بدل دینا چاہیئے نیز یہ کہ اس جرم کو متکلمین اسلام کے سر چپاں کر دینا خلاف حقیقت ہے اس لیے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ نصف متکلمین اس مذہب کے مخالف نظریہ رکھتے ہیں، رولان نے کہا ہے کہ جبریہ و قدریہ ان دونوں گروہوں نے اپنے آراء و نظریات کو کامل وضاحت سے بیان نہیں کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے اقوال وافکار باہمی اسی طرح مخالف و متناقض ہیں۔ جیسا کہ ان کے علاوہ اوروں کے اقوال میں تناقض و تضاد پایا جاتا ہے درحقیقت ہم دیکھتے ہیں کہ یہی تناقض و تغائر بعینہٖ مسیحی متکلمین کے نزدیک بھی موجود ہے۔

تو ماس اور مولینا کے نظریہ ہائے قضاء و قدر

انسانی اعمال کس نوع کے ہیں اور اعمال انسان میں ارادۂ الٰہی کی تاثیر کس حد تک ہے اس باب میں

مسیحیوں کے جو اقوال ہیں یہاں ان کا مختصر تذکرہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا، طویل صدیوں سے عیسائی دو بڑے فرقوں میں منقسم ہیں، ان میں سے ہر فریق کے بے شمار پیرو ہیں، یہ دو گروہ فرقہ لوابولا اور فرقہ ڈومینیک کے نام سے مشہور ہیں، ان دونوں گروہوں کے مابین نزاع و اختلاف برپا ہے، جس قدر کوئی فرد اپنے فریق کے مذہبی تعصب میں شدید ہے اسی قدر وہ اختلاف کی آگ کو زیادہ مشتعل کرتا ہے، ان میں سے ایک گروہ تقریباً مذہب جبریہ کا مسلک رکھتا ہے اور دوسرا البتہ اختیار کا قائل ہے، ہر فریق انتہائی طور پر اپنے عقیدہ کا پابند ہے، یہ دونوں گروہ خالق کائنات کی عظمت و بزرگی بیان کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے فرقہ کے لفظی بیان کی حفاظت کرتے ہوئے اپنے اصولوں کے دائرہ سے باہر نہیں ہوتے، پیروان ڈومینیک اپنے کو توماس کی طرف منسوب کر کے تومیون کہلاتے ہیں، تومیون کا عنوان ایک ایسا خطاب ہے جو نفوس میں ایک اثر، افکار و خیالات میں ایک مقام و منزلت اور رجحانات میں ایک غلبہ و تسلط رکھتا ہے، اسلئے کہ عوام جس عقیدہ کو فرقہ کے بادشاہ نے تقویت بہم پہنچائی ہو، اس میں تردد کرنے لگتے ہیں، مذہب توماس کا بادشاہ مقدس ہے اس لیے کہ وہ عیسائیوں کے مابین اپنی وسیع شہرت اور علوئے منزلت کی بنا پر بادشاہ مذہب سے موسوم ہو گیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ توماس کا عنوان نہایت ہی عظیم الشان عنوان ہے، جو لوگ اس عنوان و خطاب کو

اپنے لیے خاص کر چکے ہیں وہ عام طور پر اس کے اہل و مستحق نہیں ہیں،
اس کی وجہ یہ ہے کہ پیروانِ جانسانیوس ہالینڈی، جو مذہب قضا و قدر
کا قائل ہے اور جسے پوپ لیون دہم نے حرام قرار دیا تھا، اس بات کے
مدعی ہیں کہ یہ توماس مقدس مذکور کے پیرو ہیں، عیسائیوں کو گروہ ڈومینیک
کے توماس کی پیروی کے دعویٰ کو قبول کرنے سے انکار رہا ہے، اس لیے
کہ اس گروہ کا نقطۂ نگاہ قضا و قدر کی طرف مائل ہے اور توماس کا یہ
عقیدہ نہ تھا، بلکہ اس مسلک کی بنیاد ایک اندلسی شخص بائیس نامی
نے رکھی جو سولھویں صدی کے اواخر میں سلمنک میں علم کلام کا درس
دیا کرتا تھا، اس لحاظ سے ارباب یسوع مذہب ڈومینیک کو اس شخص
کی طرف منسوب کرتے ہیں، لیکن ہم توماکا نام اسی مذہب کے لیے باقی
چھوڑتے ہیں، اس دعوے کے ساتھ نہیں کہ یہ نام برحق ہے اور
نہ ہم اس مقام پر ہیں کہ اس نزاع و جدال کا فیصلہ کردیں بلکہ اس حیثیت
سے ہم اس نام کے قائل ہیں کہ یہ نام تاریخ میں اس حد تک مشہور و
معروف ہو گیا ہے کہ متکلمین داعظین اپنے آپ کو اس نام سے نسبت
دے کر اس کی تائید کرتے ہیں اور اس مذہب کی خوش اعتقادی میں
حد درجہ غلو برتتے اور اس مذہب کے رئیس کے متعلق جو اپنے پیرووں
کی بزرگی کے اسباب میں سے ہے متعصب ہیں، اور متکلمین کا تعصب
اس نوبت پر پہونچ گیا کہ اپنی تعلیمات میں وہ یہ قرار دے چکے ہیں کہ اس
رئیس سے جو بھی بیان صادر ہوتا ہے وہ ایک امر مقدس ہے اور اسکی

مخالفت حرام، اُس کے ہر حکم کو وہ ایسا تصور کرتے ہیں کہ گویا وہ معصوم شخص کی زبان سے صادر ہوا ہے جو ہر قسم کی خطا و لغزش سے پاک ہو اپنے مذہب میں مریدان مذہب پر حلف و پیمان کے ذریعہ یہ واجب گردان چکے ہیں کہ رئیس سے جو کچھ صادر ہو چکا ہے اُس کو مسلّم جان کر بدون چون و چرا قبول کر لیں، یہ حکم کس قدر مشابہ ہے، اس حکم کے جس کی فرانس کے قوانین اساسی میں تصریح کی گئی ہے:

"مجلس شوریٰ کے کسی فرد کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ حکومت جمہوری پر کوئی اعتراض کرے۔"

یعنی حکومت کا جمہوری ہونا ایک ایسا امر ہے اُس پر علی الاطلاق اعتقاد واجب ہے، اگر کلیسا سے یہ مطالبہ ہو کہ اس رئیس کے مذہب کے خلاف وہ تفسیر و تشریح کریں تو اس کا خوف ہے کہ مبادا اُس کے متبعین اپنے روابط و تعلقات اُن سے منقطع کر لیں، رئیس مذکور نے جس چیز میں مجتہدین کی بحث و نظر کو ممنوع قرار دیا ہو، مجتہدین اس کی تفسیر و تشریح کرنے سے گریز کرتے ہیں:

مقدس توماس اپنے نقطۂ فکر کو بیان کرنے سے پیشتر پیروان ڈومینیک قائل تھے کہ مریم عذرا معصومہ نہ تھیں، جس وقت توماس قدس نے اپنا نقطۂ نظر پیش کر دیا وہ اور اس کے متبعین کہنے لگے کہ مریم معصومہ ہیں، یہ ایک کھلا تناقض ہے، بس طرح انھوں نے بیان کیا ہے اہل

متناقض نظریات میں بحث و نظر حرام ہے، باقی رہا فرقہ یسوعیین تو وہ تو اس مقدس کی تعلیمات میں اس حلف و پیمان کے مقید نہیں ہیں لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ اختیار کی مدافعت کے وقت کھلم کھلا اس کی مخالفت کریں، بلکہ وہ ابانس کو طعنہ دیتے اور اس پر مذہب مولینا سے احتجاج کرتے ہیں، مولینا ایک یسوعی شخص ہے اور پرتگال کا باشندہ، اس لحاظ سے یسوعیین کو مولینون کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے، ان دو فرقوں کے مابین نزاع و کشمکش نہایت شدید تھی، ۱۵۹۸ء سے شروع ہوئی اور سترہویں صدی کے آخر تک طول کھینچا، ان دو فرقوں میں نزاع و جدال نہ ہونے کے بارے میں پادریوں کے بار بار کے احکام اور ہدایات کا کوئی اثر نہ ہوا، از سر نو بحث و نزاع کا بازار گرم ہو گیا، ہر فریق ابتدائے نزاع ہی میں اپنے فریق مخالف کو بدبختی اور مذہب و دین سے خارج ہو جانے کا الزام دیتا تھا، اس کے بعد بانس کا ظہور ہوا اس نے ہیکل کے سامنے کھڑے ہو کر مولینا کی کتاب کو حرام قرار دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ اس کتاب میں ایسے مسائل و مباحث ہیں جو تمام تر بدعت و جدت پر مبنی ہیں، پھر اس نے "بیلاج" کے مذہب کی طرف رجوع کیا، بیلاج ایک پادری تھا جو پانچویں صدی میں پیدا ہوا، اس نے انکار کیا کہ آدم نے بہشت میں جو گناہ کیا وہ قضا و قدر کے اٹل اشارے سے تھا، نیز یہ کہ گناہ آدم ہر اس گناہ کا جو بعد میں واقع ہونے والا ہے، سبب ہوگا، مولینا نے اس مسلک کا بھی رد کیا اور خود کو پیروان کلمان کی طرف منسوب کیا،

کلفان سولہویں صدی میں ایک مشہور عالم گذرا ہے، جو مذہب مسیح میں مذہب
پروٹسٹنٹ کا موسس ہے، پروٹسٹنٹوں نے جس وقت اس نزاع کو پوپ کی خدمت
میں پیش کیا وہ حیران رہ گیا اور اُسے کچھ سوجھائی نہ دیا کہ دونوں فریقوں کے درمیان
کس قسم کا فیصلہ کرے، تمام افکار و اذہان اس قضیہ کے سمجھنے کے مشتاق تھے،
جو شخص بھی علم کلام کے مباحث میں منہمک تھا وہ اس قضیہ کی تفصیل کو معلوم
کرنے کا اپنے اندر میلان رکھتا تھا، یہی واقعہ پوپ کلیمان ہفتم کے سامنے پیش
آیا، یہاں تک کہ پولس پنجم اور شہنشاہ اسپین نے پیروان توماس کی کمک و امداد کے
ذریعہ دخل دیا لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا بلکہ نزاع و جدال کی آگ کو اور
مشتعل کر دیا، پوپ پولس پنجم نے چاہا کہ انجیل میں جو احکام رواداری اور حسن سلوک
پر مبنی ہیں اُن کے ذریعہ طرفین کو نصیحت دے چنانچہ وہ کہا کرتا تھا کہ "پادریوں
کے لیے یہ کسی طرح لائق و سزاوار نہیں کہ وحشیوں کی طرح کینہ و بغض کے جذبات
کے ساتھ باہمی نزاع و کشمکش کریں" بالآخر تا حنی رم نے اس مسئلہ کو جو تمام
گناہوں کا سرچشمہ گناہ آدم ہے، بیان نہیں کیا، لیکن دونوں فریقوں کے
درمیان کسی قسم کا فیصلہ بھی نہ کیا بلکہ یہ تجویز پیش کی کہ ہر شخص اپنے مذہب کی
نشر و اشاعت کر سکتا ہے نیز یہ کہا کہ نزاع اور بحث دین میں کوئی عیب نہیں
رکھتا کیونکہ خدا تو ہر دیندار کے ساتھ ہے، مختلف مذاہب اور نظریئے
ایک دوسرے کے ذریعہ اس طرح روشن ہوتے ہیں جیسے کہ الماس دوسرے
الماس کے واسطہ سے جلا پیدا کرتا ہے؛

پیروان توماس اپنے مذہب میں بہت آگے بڑھ گئے یہاں تک کہ

اسلامی گروہ جبریہ کے مذہب کے قائل ہو گئے، بانس کا نظریہ یہ تھا کہ۔

"خداوند ہی تمام موجوداتِ عالم کا سبب ہے،
اس لحاظ سے سوائے اس کے کوئی سبب موجود
نہیں ہے، ہر سبب کا سبب خدا ہے، وہی ہر چیز
پر تسلط و قادر ہے، اس کے علاوہ کسی اور کے لیے
کوئی اقتدار اور حکومت میسر نہیں ہے"

بانس کے بعد اس کے جانشینوں نے یہ کوشش کی کہ اس کے عقیدہ جبر اور انسانی اختیار کے مابین توافق و ہم آہنگی پیدا کر دیں، یہی وجہ ہے کہ اُن کے اقوال میں اضطراب اور اُن کی عبارتوں میں ابہام و اشتباہ لاحق ہو گیا، اُن کا نظریہ یہ تھا کہ ہر عمل واجب بھی ہے اور جائز بھی، اس قول کی انھوں نے اس طرح تشریح کی کہ خدائے تعالیٰ انسان میں ارادہ کو ایجاد کرتا ہے، یہ ظاہر ہے کہ ارادہ مختار ہے، اس لحاظ سے ارادہ اپنی فطری روش اختیار کر لیتا ہے یعنی ارادہ اپنے عمل میں آزاد ہے، اُن کا یہ قول بیحد مضطرب و درہم و برہم ہے؛

آخر کار یہ نزاع و کشمکش ایک جدید مذہب پر جا کر ختم ہو گئی جو تاثیر خدا اور اختیار انسان دونوں کا قائل تھا، یہی وہ نقطۂ نگاہ ہے جس کی طرف بوسویہ مائل ہے، اس میلان کی وجہ یہ ہے کہ اُس نے ان دو مختلف نقطہ ہائے نظر کے مابین اس سے بہتر موافقت کی کوئی صورت نہیں پائی ہم اس مذہب اور نقطۂ نگاہ کی بنا یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ سبب اوّل ہے۔

اور انسان سبب ثانوی۔ میں نہیں چاہتا کہ مولینا کے زاویہ نظر کی تفسیر کروں بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ مولینا کے نظریہ کے دو الفاظ ایسے ہیں، جن کا زبان سے کہنا آسان ہے لیکن اُن کے عظیم الشان معانی کا سمجھنا آسان نہیں اسلئے کہ مولینا سے قبل علماء کا یہ قول تھا کہ فعل واجب ہے یعنی لامحالہ اُس کو واقع ہونا چاہیئے، پھر یہ فعل جائز ہے یعنی ممکن ہے کہ وہ سرزد ہو، اور ممکن ہے کہ سرزد نہ ہو، لیکن علماء نے محال کے لفظ کو ذکر نہیں کیا، مولینا نے ایک تیسرے لفظ کا اضافہ کیا اور اس کو ان دونوں حالتوں کے بین بین قرار دیا، وہ لفظ منتظر ہے، منتظر اس کے نزدیک ایک شرط کے ساتھ مقید ہو کر واجب ہے، اگر وہ شرط موجود ہوئی تو فعل واقع ہوگا ورنہ وہ سرزد نہ ہوگا، وہ منتظر کے اسم علم کو علم وسط قرار دیتا ہے اور اس نظریہ سے قدرت الٰہی کی تاثیر کو افعال میں تسلیم کرتا ہے، اس مذہب کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ مذہب اختیار کو قضا و قدر پر ترجیح دیتا ہے، اس کے برخلاف تو اس کا مذہب قضا و قدر کو اختیار پر غالب گردانتا ہے۔

جبریہ اور قدریہ اب اگر ہم اسلامی مختلف مکاتیب خیال رکھنے والے گروہوں کی طرف رجوع کریں تو معلوم ہوگا کہ قدریہ مولینوں کے ساتھ اور جبریہ تومیوں کے ساتھ بے حد مشابہت رکھتے ہیں، بقول عبدالرزاق کے ہر دو گروہ یک چشم ہیں لیکن قدریہ جو اختیار کے قائل ہیں دائیں آنکھ نہیں رکھتے، ظاہر ہے کہ دائیں آنکھ زیادہ قوی اور تیز ہے کیونکہ یہی سبب اوّل کا مشاہدہ کرتی ہے۔

لیکن جبریہ جو صرف قضاء و قدر کے دعویدار ہیں بائیں آنکھ نہیں رکھتے معلوم ہے کہ بائیں آنکھ بہت کم بین ہوتی ہے، اس لیے کہ وہ خارجی یا ثانوی سبب کو نہیں دیکھتی عبدالرزاق کے نظریہ کے مطابق۔

"وہی شخص درست نگاہ کرسکتا ہے جو دل کی دونوں آنکھوں سے دیکھتا ہے سیدھی آنکھ سے عمل کے اوّلین اسباب کا مشاہدہ کرتا ہے اور خیر و شر کے تمام افعال کو ذات واجب الوجود کی طرف رجوع کرتا ہے، بائیں آنکھ سے نسائج کو دیکھتا ہے۔ اور انسانی تاثیر کو شخصی اور ذاتی طور پر افعال میں اثر انداز پاتا ہے۔"

یہ معرکۃ الآرا مسئلہ مخصوص الفاظ و اصطلاحات کے ایجاد کا موجب ہو گیا ہے، جس کو فریقین نزاع و اختلاف کے وقت استعمال کرتے ہیں لیکن یہ سفسطہ سے خالی نہیں، مثالیں نکا دعویٰ ہے کہ ہر کام کی ایک قضا اور ہر عمل کے لیے ایک اندازہ ہے، خدا جس چیز کو وجود بخشتا ہے اُس کو اپنے فیصلہ سے جاری کرتا ہے، تقدیر سے مراد ایک مخصوص شئے کو اسی طریقہ پر نافذ کرنا ہے جو قضا میں مقرر ہو چکی ہے، اس مقصد کی وضاحت کے لیے عبدالرزاق نے اس قصہ کو ذکر کیا ہے۔

"ایک روز پیغمبر علیہ السلام ایک سڑک پر جا رہے تھے، وہاں ایک دیوار دیکھی جو منہدم ہوا چاہتی تھی، آنحضرتؐ اس دیوار سے پرے ہٹ گئے

ایک صحابی نے عرض کیا آیا آپ قضاء الٰہی سے فرار ہونا چاہتے ہیں آپ نے جواب دیا قضاء الٰہی سے تقدیر خداوندی کی طرف فرار ہوتا ہوں۔

ایک تیسرے مذہب کا ظہور ہوا جس نے جبریہ و قدریہ کے مابین موافقت پیدا کرنے کی کوشش کی، اس مذہب کے ماننے والوں کا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی افعال و اعمال نہ تو قضاء مطلق کا نتیجہ ہیں اور نہ اختیار مطلق کا مجموعہ، بلکہ ان دونوں کے مابین ایک اعتدالی کیفیت سے ہم آہنگ ہیں، ایک ہی فعل دو اثرات کا نتیجہ ہے ایک الٰہی اثر اور دوسرا انسانی اثر، اس متوسط معنی کے لیے ایک مخصوص لفظ وضع کیا ہے، جس کا نام انھوں نے کسب اختیاری دے رکھا ہے، اصحاب جدال و بحث کے نزدیک یہ لفظ ایک خزانہ شمار کیا جاتا ہے، ان کا قول ہے کہ افعال ارادۂ الٰہی سے پیدا ہوتے ہیں، انسان اپنے اختیار کے ذریعہ ان افعال کو کسب کرتا ہے، انھوں نے بعض متناقض آثار و روایات کے مابین موافقت پیدا کر دی ہے۔ یہ ہم آہنگی و تطابق اس مقصد کے لیے نہیں کہ اہل السنت والجماعت کے مذہب کو کمزور کر دیں بلکہ اس کی اصل غرض و غایت یہ بیان کر دینا ہے کہ قضاء ازلی ایک ایسا راز سربستہ ہے جو ہنوز پردۂ خفا میں مستور رہے؛

جس وقت پیغمبر علیہ السلام سے ابوھریرہ کے انجام کے متعلق سوال کیا گیا تو آنحضرت نے مختصر پیرایہ میں فرمایا، "قسمت کا قلم خشک ہو چکا" اس ایجازی جواب کا مطلب یہ ہے کہ ہر مخلوق کا انجام روز ازل ہی سے

لوحِ محفوظ میں قلمبند کر دیا گیا ہے، اور اس میں ذرا بھر تغیر و تبدل نہ ہوگا مگر ایک جماعت نے آنحضرت سے سوال کیا پھر لوگ کس لیے عمل کرتے ہیں آپ نے جواب دیا۔

"تم عمل کیے جاؤ کیونکہ خدا نے تم میں سے ہر ایک کے اندر ایک ایسی چیز پیدا کر دی ہے کہ اس چیز کے ذریعہ جس غرض کے لیے اس کو پیدا کیا گیا ہے اُسے بروئے کار لانے کے لیے اس شخص کے اندر قدرت ودیعت رکھی گئی ہے۔"

یہ جواب تقریباً میر فلیٹ اور اس کے بعد ھیگل کے نظریہ کے مطابق ہے، انھوں نے یہ کہا ہے کہ انسان حال و مستقبل کے اعمال کے این خلق ہوا ہے۔ عبدالرزاق کا مسلک موجودہ دور میں تو میور ہے کے نقطۂ نظر کے بہت قریب ہے، یہ دو مذہب اس امر پر متفق ہیں کہ وجودِ افعال میں اختیار کو دخل ہے، نیز یہ کہ جو کچھ مقدر ہو چکا ہے ایک پہلو سے حتمی ہے اور دوسرے پہلو سے جائز، یہ ایسا نتیجہ ہے جسے ہم نہیں سمجھ سکتے، عبدالرزاق کہتا ہے کہ قضا، خود فعل اور اس فعل کی کیفیت کے وقوع کو شامل ہوتی ہے، یہ کیفیت انسانی اختیار ہے، بوسویہ کا مدت کے بعد ظہور ہوا اور اس نے اس موضوع کی تشریح اسی نہج سے کی جیسا کہ عبدالرزاق اس سے پیشتر تفسیر کر چکا تھا اس نے کہا کہ انسان اپنے عمل کو اختیار اور قضائے الٰہی سے انجام دیتا ہے،

خدا نے ارادہ کر لیا ہے کہ انسان مختار رہے اس لیے تمام اور ہر فعل میں اختیار اُس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے تا آنکہ فعل موجود ہو جائے، صرف یہی ایک مسئلہ نہیں ہے جس میں عیسائی مسلمانوں کے ساتھ مشابہت پیدا کرتے ہیں بلکہ اس مسئلے کے علاوہ اور بہت سے امور ہیں جن میں یہ دونوں برابر ہیں، مثلاً عدل و مسئولیت بندہ، سرچشمہ شر، آخرت میں خدا کی جانب سے انعام اکرام کا عطا کیا جانا وغیرہ۔

ہم عنانِ قلم کو اسی جگہ اس موضوع میں جولانی دکھانے سے روک لیتے ہیں، لیکن قارئین سے امید ہے کہ وہ ذیل کی ایک تشبیہ و تمثیل میں غور و خوض کریں گے جس کو عبدالرزاق موصوف نے اپنی دلیل کی تائید کے موقعہ پر کہا ہے میں اس کو یہاں ذکر کرتا ہوں، عبدالرزاق نے ایک روز اپنے ایک شاگرد کو اس مسئلہ کا سبب بیان کرنا چاہا کہ کیا وجہ ہے کہ ایک بدکردار اور بد باطن شخص شر کو خیر پر ترجیح دیتا ہے باوجود یہ کہ اس کو علم ہے کہ خیر شر سے بہتر ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے شخص کی مثال ایک سیاہ حبشی کی طرح ہے جو اپنے بچوں سے محبت رکھتا ہے حالانکہ یہ قبیح صورت ہیں، نیز یہ ان کو ترکوں کے لڑکوں سے اچھے اور خوبصورت سمجھتا ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ ترکی بچوں کا حسن و جمال ان کے بچوں سے کہیں بالاتر ہے؛

ان مقدمات کی ترتیب سے معلوم ہوا کہ تسلیم قضاء و قدر ہی اسلامی اصول نہیں ہے بلکہ یہ تسلیم بعض علمائے اسلام کا مسلک ہے، ان علماء نے

عیسائیوں کی طرح ابتداء میں یہ بیان کیا کہ افعال میں سبب ثانوی سبب اصلی کا تابع ہے، اس کے بعد ہنگامۂ نزاع اس قدر تیز ہو گیا کہ نمایاں طور پر یہ دکھائی دینے لگا کہ انھوں نے اس بیان میں مبالغہ برتا، اور ایسی چیز کہی جو دائرۂ عقل و فہم سے نامحجوب ہے اس کا سبب یہ ہے کہ مختلف مسالک و نقطہائے خیال کی شان ہی فرقہ وارانہ نزاع و جدال کا وقوع پذیر ہو جانا ہے، بقول ایبسون کے مناظروں اور مناقشوں میں صلح و آشتی اور رواداری کے جذبات مسلط نہیں ہوتے اور تنہا معقولات کی فرمان روائی نہیں ہوتی، اس کے بعد مسلمانوں یا عیسائیوں میں سے ایسے اشخاص کا ظہور رہا جنھوں نے مختلف و متضاد اقوال و عبارات کی نشر و اشاعت کی، مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا یہی واقعہ ہر زمانے میں پیش آیا کرتا ہے، خدا نے انسان کی جو فطرت و طبیعت بنائی ہے اس میں تغیر و تبدل پیدا نہیں ہوگا، قضاء و قدر جیسے مشکل مسئلہ کا کوئی پسندیدہ حل پیش کرنے سے انسانی عقل سرگرداں و حیران ہے، لہٰذا ارادۂ خداوندی اور ارادۂ انسان کو ہر فعل کے وجود میں اس شرط کے ساتھ یکجا کر دینا کہ ان میں سے کوئی ارادہ کسی ایک میں بھی فنا پذیر نہ ہو، نہایت ہی دشوار بحث ہے، اور یہ مذہب موحدین کے نزدیک بلا کسی استثنے کے پسندیدہ نہیں ہے، متکلمین کہتے ہیں کہ فلاں قضا ہے، حکم ازلی ہے، تاثیر ہے، نیز میلان، استعداد اور احتیاج وغیرہ یہ تمام ایسے الفاظ ہیں جو اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ مجہول اشیاء اور مبہم مسائل کے استنباط میں عقل و فکر کی بہت زیادہ توانائیاں صرف.

ہوئی ہیں، جس قدر متکلمین محققین افعالِ بشر میں تاثیر قدرت الٰہی کی
کیفیت کی تفسیر و تفتیش کرتے ہیں اسی قدر وہ اوہام و ظنون کی گھٹا ٹوپ
تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں، اس لیے کہ جو مشعل فکر ان کی
رہنمائی کرتی ہے وہ انسانی مشعل ہے، خدا کو انسان پر قیاس کرنا صحیح
نہیں ہے، کس قدر تعجب کی بات ہے کہ ایک شخص اپنی کمزور عقل کے
ذریعہ سبب الٰہی و بشری کے درمیان ایک ایسے فاسد ترازو سے موازنہ
کرتا ہے جس کے دو پلڑوں میں سے ایک سے تھوڑی سی مقدار اٹھا لی
جائے اور دوسرے پلڑے کو بحال رکھا جائے تو پہلا پلڑا نہایت سرعت سے
نیچے آجاتا ہے اور اس تیزی سے دوسرا پلڑا اوپر کو اٹھ جاتا ہے، یہ اس
امر کی دلیل ہے کہ انسانی و الٰہی سبب کی کیفیت پر غور و خوض کرنا صحیح نہیں ہے
ماحصل کلام یہ کہ خدا کا علم اور اس کی قدرت ہمارے افکار و میلانات
کے مطابق، ہمارے اختیار کے منافی ہے، ہمیں علم و قدرت الٰہی کا
حقیقی علم ہے اس لیے ہم کو لامحالہ ان چیزوں کی تصدیق کر لینی چاہیئے
لیکن فلاسفہ و حکماء اس کلیہ سے روگردانی کرتے اور اپنے ذہنی و دماغی
قویٰ اور زندگی کے قیمتی لمحات کو ایک ایسے امر کی تحقیق و تفتیش میں
ضائع کرتے ہیں جو ان کے بس میں نہیں ہے، اور اس عقدۂ لاینحل
کو حل کرنے میں ان کا کوئی فائدہ نہیں، اس لیے کہ یہ ایسے مسائل و
حقائق ہیں جن کو عالم و جاہل انسانوں نے بھی بلا کسی مزاحمت و روگردانی
کے قبول کر لیا ہے، اس لحاظ سے اختیار انسان کے اندر ایک ادعائی

مَبداء ہے جس کی تصدیق بدیہی ہے، جیساکہ کانٹ کہتا ہے کہ انسانی اختیار اہلِ بحث وتحقیق کے مناقشوں اور بحثوں سے کوسوں دُور ہے، اور انسانی ذہن ودماغ اور فلسفہ وحکمت کی موشگافیوں کا اُس پر کوئی اثر نہیں ہوتا؛

لوتھر "کلفان" کی کتاب کے مُطالعہ سے اِس امر کا قائل ہے کہ انسان مادی عوامل و موثرات کو قبول کرنے پر آمادہ و مستعد ہے، اِس کے باوجود ہم کیتھولک اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ یہ محسوس کرتے ہوں کہ وہ اپنے افعال میں آزاد نہیں ہیں۔

مخالفین نے مسلمانوں پر تسلیم قضاء وقدر کا جو الزام عائد کیا ہے اگر ہم اس الزام کے سبب کو بنظرِ تحقیق دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اِس بہتان کا سبب صرف اِس لیے پیدا ہوگیا ہے کہ لوگوں نے قضاء وقدر کی حقیقت کی فضیلت کا جو اِس دین کے خصائص میں سے ہے ادراک نہیں کیا ہے، اِس سرچشمہ سے اسلام کا نام پھوٹ نکلا ہے، اِس حقیقت سے مراد صبر وتحمل ہے، شاذ ونادر ہی کوئی ایسا مذہب ہوگا جو انسانوں کو ارادۂ الٰہی کے متعلق انقیاد و اطاعت کا اِس طرح حکم دیتا ہو جیساکہ اِسلام نے دیا ہے، مسلمان اِسی اصول پر عمل کرتے ہیں، اِس اصول کی پابندی واستحکام میں اربابِ کلیسا مسلمانوں پر کوئی تفوق نہیں رکھتے، مسلمان جو بعض الفاظ استعمال کرتے ہیں مثلاً مصیبت کے وقت کہتے ہیں کہ یہ ہماری تقدیر ہے، اگر اُن کے ذریعہ ہم یہ حکم لگائیں

کہ مسلمانوں کا مذہب قضا و قدر پر مبنی تسلیم خم کر دینا ہے تو ہمارا یہ حکم لگانا غلط ہوگا، کیونکہ وہ اس قسم کے الفاظ کے ذریعہ خالق ارض و سماد کے متعلق اپنے عجز و انکسار کا اظہار و اعتراف کرتے ہیں، جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں "یہ تو تمہاری مشیت سے ہوا" اسی طرح مسلمانوں کی ثبات قدمی موت سے خوف نہ کھانا، جنگی میدانوں میں تہور آمیز شجاعت کے ساتھ اقدام کرنا اور موجودہ دور میں اپنے سروں کو یورپی لشکر کے نیزوں کے مقابلہ میں لاکھڑا کر دینا یہ تمام وہ مثالیں جرأت و واقعات ہیں جن کو عیسائی تسلیم قضا و قدر کی طرف منسوب کرتے ہیں، یہ بھی بہت بڑی غلطی ہے کیونکہ مسلمان کا قرقتل ہے ہم آغوش ہوتے وقت مسکرانا اور جنگوں کے خطروں میں بے دھڑک کود پڑنا اس کے جنت الفردوس پر اعتقاد رکھنے اور اس کے شدت یقین اور قوت ایمان کی پیداوار ہے، کیوں کہ یہ اعتقاد و ایمان اس کے نفس میں ایسا اثر کر جاتا ہے کہ موت سے وہ اطمینان کے ساتھ ہم آغوش ہو جاتا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نے انسان پر اس دنیا سے کوچ کر جانے کو جو سہل و آسان بنا دیا ہے اس کے ذریعہ... نہایت دشوار گزار مشکلات میں سے ایک سخت مشکل کو حل کر دیا ہے، ایسے خوبیوں والے دین کی طرف یہ منسوب کرنا کہ جذبات شجاعت کے ذریعہ اسلام نے مسلمانوں کے اخلاق بگاڑ دیا

یا اُن کے عزم و ہمت میں کوتاہی و سستی پیدا کر دی ہے کس قدر معیوب بات ہے۔

باب ششم

عربوں کے دورِ فتوحات میں اسلام کی نشر و اشاعت

ممالکِ اسلامیہ کے حدود کا تعین عیسائیوں کے ذہنوں میں اسلام کی نشر و اشاعت کے جو غلط اسباب جاگزیں ہو گئے ہیں ہم نے ان کو بیان کر دیا اور ان کے فاسد باطل پہلوؤں کو بھی معلوم کر لیا، ہم نے وعدہ کیا تھا کہ جہاں ہم ادوارِ حاضر میں اسلام کی پیش قدمی پر بحث کریں گے وہاں اسلام کی نشر و اشاعت کے حقیقی اسباب و علل کی نقاب کشائی کریں گے، اس لیے کہ ہمارا یہ نظریہ ہے کہ عصر حاضر میں دین اسلام کا حقیقی مطالعہ ان اشخاص کے تصورات و نظریات کو جو اس وہم و گمان سے آلودہ تھے کہ اسلام نوک شمشیر سے پھیلا ہے، بالکلیہ دور کر دیتا ہے، چنانچہ ہم گذشتہ ابواب میں اس عقیدہ و نظریہ کی کمزوری پر تفصیلی روشنی ڈال چکے ہیں، اگر دین اسلام جبر و اکراہ کے ذریعہ پھیلا ہوتا تو مسلمانوں کی فتوحات کا

یسلاب رک جانا چاہیے تھا' باوجود اس کے ہم دیکھ رہے ہیں کہ قرآن حکیم تمام سطح ارضی پر سایہ گستر ہے' اسلامی فیوض و برکات کی موجودہ ایام میں مسلسل حرکت ہمیں یہ عقیدہ رکھنے پر مجبور کر رہی ہے کہ اسلام ہندوؤں کے بدھ مت مذہب اور مذہب مسیحیت کے بعد تیسرا مذہب ہے جو انسانی طبیعت و فطرت کے موافق و ہم آہنگ ہے' اوروں نے گمان کر لیا ہے کہ اسلام تمدنِ عرب اور تربیتِ خلفاء اسلام کا تابع و رہینِ منت ہے' جو دمشق' قرطبہ اور بغداد میں انسانی نفوس و اذہان کو اپنی طرف جذب کیا کرتا تھا' اور اس تمدن اور نظامِ تربیت کے زوال کے بعد اسلام پر بھی انحطاط رُونما ہو گیا؛

بارتھی سانٹ ھیلیر کہتا ہے کہ اس کے بعد کسی شخص نے بھی اسلام قبول نہ کیا' واقعہ یہ ہے کہ ان سطح بین و کوتاہ نظر اشخاص نے اسلام کی نشر و اشاعت اور تمدنِ عرب ان دو امور کے مابین تمیز کرنے میں سخت دھوکا کھایا ہے' باقی رہا تمدن تو وہ اسلام میں ایک ناقابلِ اعتنا یا ہنا قصور اسلام سے شئے ہے' بہر حال تمدن ایک عارضی امر ہے جو اسلام میں ضمنی طور پر پیدا ہو گیا' اس کے لیئے ایسے حالات و ظروف مساعد تھے جو قرآن کے پہلو بہ پہلو نشوونما پائے' اگر وہ تمدن دوام و استمرار پیدا کر لیتا تو دینِ اسلام کی رونق اور درخشانی سرد پڑ جاتی' اس لیے کہ آغازِ اسلام میں امراء کے اندر بے اعتقادی اور قلتِ ایمانی کے جذبات متحرک تھے اور قوم اوہام و تخیلات کی وادیوں میں سرگرداں' اسی اثناء میں

جب کہ مسلمان خلفاء کے شہر کمال ارتقاء پر گامزن تھے، ان کے شہزادے ادباء اور فلاسفہ ان ملکوں میں مباحثہ و مناظرہ میں مشغول تھے اور علوم و فنون کے دفینے نکالنے میں محو اور تحقیق و تفتیش میں سرگرم تھے، تو ایسی حالت میں عرب، لیبیا اور افریقہ کے صحراؤں میں دین اسلام اپنے اصلی خط و خال میں نمایاں ہو رہا تھا، جس کو اسلامی اصول و قوانین سے ناواقف اشخاص اور تعلیمات اسلام سے نا آشنا ہاتھ نہیں چھو سکتے تھے، وہ تمام اسی دین کے مبلغین کا سرچشمہ تھا جو اکناف و اطراف ممالک میں منتشر ہو گئے، چنانچہ ان کی جستہ جستہ قبریں جنھیں آج ہم شمالی افریقہ میں مشاہدہ کرتے ہیں، ہمارے اس دعوے و مقصد پر دلالت کرتے ہیں۔

ہم اپنی بحث کو براعظم افریقہ میں قرآن مجید کی نشر و اشاعت پر منحصر رکھتے ہیں اس ضمن میں یہ بھی ذکر کرتے ہیں کہ چین میں دو کروڑ[1] فرزندان اسلام ہیں، اور مسلمان جو چینیوں کے نزدیک ہوئی ہوئی کے نام سے پکارے جاتے ہیں، مملکت وسطی میں ایک بلند مرتبہ رکھتے ہیں، موسیو دا فیلیت ان اشخاص میں سے ایک ہے جو وہاں کے آس پاس کے علاقوں میں اسلامی تحقیقات و مطالعہ میں مصروف رہا ہے وہ کہتا ہے کہ "اسلام اب اس منزل پر پہونچ گیا ہے کہ ساکیا موٹی[2]

---

[1] آج کل ان کی تعداد سات کروڑ تک ہے۔ ۱۲
[2] ساکیا موٹی چین کا ایک بادشاہ ہے، جس نے انتیس سال کی عمر میں دنیا

مذہب کے قائم مقام ہو جائے، مسلمان حکومت الٰہیہ کا پختہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اسلام لامحالہ آئندہ اس قدر اقتدار و عروج حاصل کرے گا کہ بودھ مت کا قدیم مذہب اُن ممالک سے ناپید ہو جائے گا۔" یہ مسئلہ نہایت اہم اور معرکۃ الآرا مسائل میں سے ہے، اس لیے کہ چین کرۂ ارض کا ایک تہائی حصہ ہے یا یہاں کے انسانوں کی آبادی دنیا کے اور ممالک کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے، پس اگر یہاں کے تمام باشندے مسلمان ہو جائیں تو اُن ممالک میں ایک عظیم الشان انقلاب اور اہم ترین تغیر رونما ہو جائے گا اور دین اسلام جبل الطارق سے لے کر بحر الکاہل تک پھیل جائے گا، پھر ایک اور دفعہ عیسائیت کا سینہ لرز اٹھے گا، یہ بخوبی معلوم ہے کہ باشندگان چین مزدور ہیں اُن کے اخلاق پست ہیں، آج دنیا کی تمام قومیں باشندگان چین کے کام سے فائدہ اٹھا رہی ہیں، اس لحاظ سے اگر دین اسلام کا

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۱۹۱) کنارہ کشی اختیار کر لی اور علوم و فنون میں مصروف ہو گیا یہاں تک کہ اُس نے علوم میں مہارت حاصل کر لی اور اپنا نام بدھ رکھ چھوڑا، بودھ کے معنی عالم یا روشن ضمیر کے ہیں اُس نے ایک ایسا مذہب پیش کیا جس کو اہل چین اور ہندوؤں نے اپنا مذہب قرار دے دیا ہے، بودھ کا ظہور حضرت مسیح سے گیارہ سو سال پیشتر ہو چکا تھا، بعضوں کا قول ہے کہ بدھ کی پیدائش کا سن ساتویں صدی قبل مسیح ہے اور یہی قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ۱۲

تعصب اپنی شدت و قوت کیساتھ اس قوم میں سرایت کر جائے تو دوسری قوموں کو اندیشہ ناک رہنا چاہیئے کہ مبادا اس قوم کے زیر فرمان رہ دائی ان کا زوال ہو جائے[1]

موسیو مونٹیٹ کہتا ہے کہ "یہ امر مسلّم ہے کہ اسلام تمام دوسرے ادیان و مذاہب پر جو چین میں باہمی کشمکش میں مصروف ہیں غالب آ جائے گا[2] یورپ میں اسلام کی چہل پہل کم ہے لیکن اس کے باوجود شمال ترکی میں لیتھوانیا تک اسلام کا وجود مسعود ہے۔ امریکہ میں بھی حبشیوں وغیرہ نے اسلام کو داخل کر دیا ہے لیکن افریقہ ہمیشہ سے اسلام کا برگزیدہ مسلک ہے' اور افریقہ میں اسلام کا وہی مقام و درجہ ہے جو عیسائیت کا یورپ میں ہے" موسیو بولیناک کہتا ہے کہ "مسلمان یا والیون سے ہٹ کر لی موزامبیق تک کے تمام ساحلوں میں سکونت پذیر ہیں' اور ان کا سلسلہ اکثر جا ملتا ہے (مغاربہ) اور مشرق تک دیا ہے وسط افریقہ میں اسلام بحر احمر سے لیکر اٹلانٹک تک اور یہاں سے بحیرۂ روم تک پھیلا ہوا ہے۔ ڈغاسکر میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے یہاں تک کہ بعض مستشرقین کا یہ خیال ہے کہ جزیرہ ڈغاسکر کا اصلی نام عربوں سے ماخوذ ہے" موسیو مونٹیٹ کہتا ہے کہ اسلام افریقہ میں نہایت سرعت کے ساتھ پھیل رہا ہے اور اپنے کمال درجہ تک ترقی کر رہا ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان یہاں کے

---

[1] ملاحظہ ہو موسیو ڈابری کی کتاب "چین میں دین محمدی" ۱۲۰

[2] ملاحظہ ہو مجلہ تاریخ ادیان ماہ جون سنہ ۱۸۹۹ء

شمالی حصّوں میں اپنا مضبوط مقام رکھتے ہیں، جو علاقے صحرا پر منتہی ہو کر سوڈان کے وسیع خطوں تک پہونچتے ہیں اُن کو اپنی دینی مملکت پر کوئی اندیشہ و خطرہ نہیں یہاں کوئی مذہب دینِ اسلام سے نبرد آزما نہیں ہو سکتا، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اور ہمیشہ اسلام نشو و ارتقاء کے مراحل تیزی سے طے کر رہا ہے۔

اِسلام سوڈان سے لیکر خط استواء کے آس پاس تک پھیل چکا ہے اور بلاد نائجیریا میں فرانسیسی خطوں تک دراز ہو گیا ہے، اس لحاظ سے فوجوں کے سپہ سالار اور جنرل سطحی طور پر ہی سہی اسلام کی رفتار کو جان چکے ہیں، لیکن ہمیں اسلامی رفتار پر پوری آگاہی اسی وقت ہوئی جب کہ ہم کونغو پر تسلط ہو گئے ہم نے یہاں دیکھا کہ اسلامی قافلے ہمارے سامنے سے اس طرح بھاگتے ہیں جیسا کہ کوئی جماعت اجنبی کو دیکھ کر روپوش ہونا چاہتی ہے، اور آج کل مسلمان ہمارے شمالی افریقہ کے خطوں اور ہمارے کانغو اور مستعمرات کے مراکز میں ایک حلقہ کی طرح محصور ہو گئے ہیں جس کو ہم اپنے سیاسی مصالح و مقتضیات کے مطابق تنگ کر دیتے یا کشادہ کر دیتے ہیں۔

وسطِ افریقہ میں اسلام کا پھیلاؤ ... وسط افریقہ میں اسلام کی نشر و اشاعت کے دو سرچشمے ہیں ایک مغرب میں جو قدیم زمانے سے چلا آتا ہے اور جس کا اثر ساحل اٹلانٹک تک پھیلا ہوا ہے، اور یہاں سب سے پہلے اسلام کا داخلہ ہوا اور یہاں کے باشندے قرآن کے معتقد ہو گئے ہیں، لیکن منغان کی جانب سے بلاد نائجیریا تک فرانسیسی

کی پیش قدمی کے مقابلہ میں ٹوٹ گیا اور برابر یہاں سے لوٹتا جا رہا ہے یہاں تک کہ "ٹمبکٹو" سے جو اس کا اصلی سرچشمہ ہے "سقطو" پھر یہاں سے کانو تک اور یہاں سے "کوکا" تک چلا گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہیں مقیم ہو گیا ہوگا، اسلام کا دوسرا سرچشمہ مشرق میں ہے اور یہ سرچشمہ تازہ ہے، جس کا اثر گروہ سنوسی کے رئیس و پیشوا کے ذریعہ "دادای" اور "دارفور" کے درمیان تک پہونچا ہے، ان دونوں سرچشموں کے مابین "شاد" "شاری" اور جنوبی "لوغونی" کی نہریں حائل ہیں، اہل مشرق اہل مغرب کے مقابلہ میں جنگجو اور متعصب ہیں اور تجارت اور باہمی صلح پسندی کی طرف مائل ان دونوں جماعتوں نے اسلام کو اپنی ہمسایہ بت پرست قوموں کے درمیان بارہ ہزار کیلومیٹر کے فاصلے سے آگے بڑھایا یہاں تک کہ نغو کے قریب نہر شاد کے اطراف فرانسیسیوں سے نبرد آزما ہو گئے اور اس تدبیر سے ان کو خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا، اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ اُن ملکوں سے ہجرت کر گئے تھے جو غیر قوموں کے حملوں کا نشانہ تھے، اور انھوں نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ کافروں سے جنگ نہیں کریں گے، اور بت پرستوں کے علاوہ جنھیں اہل یورپ کی کوئی خبر نہیں کسی اور کو نہ پائیں گے، بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ جن اہل یورپ نے ان سے جنگ کی وہ دور دراز ملکوں سے جنوب میں آئے ہوئے تھے، اس کے بعد ان ملکوں میں اُن کی سلطنت مستحکم ہو گئی، یہ بہت سی کشتیوں اور توپوں کے مالک تھے، جو وسیع دریاؤں میں آمد و رفت کرتے اور مشرق سے مغرب کی طرف

نقل و حرکت کیا کرتے تھے۔

مسلمان تجار اور موحدین یورپ | اسلام کی ترویج و تبلیغ کے لئے جو امور و اسباب درپیش ہیں ان میں جو امر اہمیت رکھتا ہے وہ اہلِ یورپ کا وسط افریقہ میں بود و باش اختیار کرنا اور نہر کونغو کے ممالک میں اُن کا وارد ہونا ہے، اس لیے کہ اہلِ یورپ نے اس ترتیب سے براعظم افریقہ کو ایک جانب سے دوسری جانب تقسیم کر دیا ہے، اسلام جو طمانیت سے تدریجی طور پر شمال سے جنوب میں نقل و حرکت کر رہا تھا، معرضِ خطر میں واقع ہوتا ہے، اسی طرح وہ تجارت بھی معرضِ خطر میں ہے، جو اسلامی قافلوں کے ذریعہ واقع ہوتی تھی، اور اس تجارت کی گزرگاہ تبدیل ہو کر مغربی سمت سے نہر کونغو کی طرف مائل ہو جاتی ہے، اسی لیے اُن ممالک کے حالات کے اس تغیر و تبدل کی وجہ سے مسلمان رؤسا کی توجہات اس طرف بے حد مبذول ہو گئی ہیں، جو اہلِ یورپ کونغو کی طرف سے آئے ہیں اُن کا مقابلہ سوڈان سے آئے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ کیا جائے اور اُن سے نتیجہ اخذ کیا جائے تو یہ ایک محقق کے لیے کارآمد اور سودمند ثابت ہوگا، لیکن یہ بحث ہمارے موضوع و مقصد سے دُور ہے، اس لیے ہم یہ بیان کرنے پر اکتفاء کریں گے کہ اس درجہ قومی اسلامی زندگی کا سبب کیا تھا اور اس درجہ حیرت انگیز طریقے سے اسلام کی نشر و اشاعت کس طرح ہوئی؟

اسلام کا آغاز اور اس کا انجام | یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ

اسلام بالطبع بدھ مت اور عیسائیت کی طرح ایک عالمگیر دین تھا یا کسی قوم کا خصوصی مذہب، یہ وہ بحث ہے جس کو موسیو کینان نے شروع کیا ہے۔ اس مسئلہ کا جواب نہایت واضح ہے اور علمی حیثیت سے اس میں کوئی شک شبہ کی گنجائش نہیں ہے، اسلام بے شبہ ہر جہتی اور عالمگیر دین ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان ہر قوم میں بلا اختلاف رنگ و نسل اور بلالحاظ قوم و وطن موجود ہیں اور ان میں مشرقی، تاتاری، مغربی، ہندی اور حبشی ہر قسم کے عناصر شریک ہیں، باقی رہا یہ کہ جس مسئلہ کو ہم موسیو کینان کے ساتھ سمجھنا چاہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ اسلام کی یہ جہانگیر عمومی حالت اپنے مزاج دینی سے پیدا ہوئی ہے یا دیگر حالات و اسباب کی وجہ سے؟ موسیو کینان کا نظریہ یہ ہے کہ ملت عربی اس دین کی طبعی و فطری پرورش گاہ تھی بلکہ اسلام اسی قوم کے متعلق نازل ہوا ہے، اس لیے فطری طور پر اس دین کا مزاج یہ نہیں ہے کہ وہ عالمگیر اور عمومی کہلایا جاسکے، یہ نظریہ محض اس وجہ سے پیدا ہوگیا ہے کہ موضوع کے صرف ایک رخ پر غور کیا گیا ہے، اس لیے کہ دین اسلام جس کا منشاء و مولد قرآن مجید اور سنت نبوی ہے وہی ہے جس کو کوئی معقول شخص اعتراف کرتا ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ ایک عمومی اور ہر جہتی دین ہے جو اسی اولین دین سے پیدا ہوا ہے۔ اس عالمگیر دین کی نقل و حرکت ابتدائی حالت سے ثانوی حالت میں بتدریج اس طرح حاصل ہوئی ہے کہ اس عہد رفتہ و ادوار کی کیفیت کو کسی قاعدہ و قانون کے تحت بیان نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تغیر و تبدل زمانے کے احوال و ظروف اور مختلف قوموں کی تاثیرات کے

کے ذریعہ سے جو اس دین کو قبول کر چکی ہیں، اس طرح حاصل ہو گیا کہ ہمیں یہ فرق اور تمیز کرنا بے انتہا مشکل ہے کہ اسلام کی اصلی تاثیر کی مقدار کیا ہے جو ابتدائی دور میں اُس کے اندر موجود تھی اور اس کے بعد موجودہ دور میں بحالتِ موجودہ اُس کے اندر تاثیر کی کتنی مقدار پائی جاتی ہے، اس لحاظ سے موسیو کیتانی کو غمزدہ نہ ہونا چاہیئے اگر ہم اُس تقسیم کو جو موصوف نے اسلام کے متعلق اوّل و لاحق کے ذریعہ کیا ہے، حذف کر دیں اور اس طرح کہیں جیسا کہ خود اس نے اپنی کتاب میں کہا ہے۔ اسلام عالمگیر اور عمومی دین ہے، علاوہ بریں اپنے ابتدائی دور سے دوسرے دور میں نقل و حرکت کرنا یہ امر کچھ دین اسلام ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ تمام ادیان و مذاہب اسی قاعدۂ کلیہ کے اندر شریک ہیں۔

اسلام کی نشر و اشاعت کے اسباب

جن چیزوں کو موجودہ دور میں اسلام کی حالت سے نسبت دی جاتی ہے اُن میں سے طریقۂ زہد کی ترویج و اشاعت، بعض اولیاء و موتی کے ساتھ حسنِ عقیدت اور بہت سے تعبدی طریقوں کا اعتقاد ہے، اُس کا سبب یہ ہے کہ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنے ہی مذہب کا حریص ہوتا ہے ہر شخص کی ایک مقررہ آرزو ہوتی ہے، اسی نقطۂ نظر سے اُن خواہشاتِ نفسانی کی آگ کو فرو کرنے کے لیے جن کو اگر ڈھیل دی جائے تو اُن میں اشتعال انگیزی کی کیفیت بڑھتی جائے گی، اس قسم کے نقطہائے فکر و خیال پیدا ہو گئے اور مختلف معتقدات و توہمات انسانی ذہن پر مسلط ہو گئے۔ اسلام بھی

اُن لوازم سے نجات نہ پاسکا بلکہ انہی افکار و معتقدات میں گھر گیا، لیکن اس طرح کہ اس نے اُن تمام کو اپنے اندر جذب کر کے اُن کو حقیقی شکل و صورت میں پیش کر دیا، یہ اسلامی پیش قدمی اور ترقی کا ایک عظیم الشان سبب ہے، اگرچہ اسلامی فطرت و طبیعت کے مناقض ایک سبب شمار ہوگا، اس لیے کہ یہ معتقدات و خیالات مبداء اسلام کے مخالف ہیں، ہم ایسے اشخاص کا ملاحظہ کرتے ہیں جو آسمان کی جانب اپنے سر اٹھائے ہوئے ہیں اور اُن کی یہ خواہش ہے کہ ہوش و حواس سے مجرد و بیگانہ ہو جائیں اور اُن کی تمنا یہ ہے کہ حضرت حق جل مجدہ کا مشاہدہ کریں جیسا کہ مذہب تصوف میں اس کا طریقہ بیان کیا گیا ہے، اس طریقہ سے عبادت و بندگی سہل ہو جاتی ہے، بہت کم علماء ایسے ہیں جن کا عقیدہ محکم ہو، اور وہ اس امر کو موجب ملامت گردانتے ہوں کہ زہد و عبادت کا یہ طریقہ یعنی بندہ کا خدا کے ساتھ اتصال کا اعتقاد مذہب توحید (وحدۃ الوجود) کے مخالف ہے، بعض اشخاص خود کو اپنے پروردگار سے دور شمار کرتے ہیں اور اپنی دعاؤں کو بارگاہِ ایزدی تک نہیں پہونچا سکتے، بعض لوگوں کی دعا بعض اوقات انتہائی تعجب خیز ہوتی ہے مثلاً وہ اس طرح دعا کرتے ہیں کہ "پروردگار مجھے نرینہ اولاد عطا کر اور میرے مویشی مادہ بچے ہی جنتے رہیں"، اس قبیل کے مطالب کے سمجھنے کے اسلام میں واصلین کا مذہب پیدا ہوا اور ایسے لوگ ظہور پذیر ہوئے گویا بہت سے عطایائے الٰہی عوام الناس کے اعتقاد کے مطابق انہی کے ہاتھوں میں ہیں، بہت سے گمراہ لوگ ان واصلین کی طرف جوق در جوق آتے ہیں،

چور، اُچکے، بدمعاش، فقیر درویش، بے اولاد عورتیں اور نوجوان جو پشتارانِ دولت وجاہ ہیں، اور بوڑھے جن کے قویٰ پر ضعف و اضمحلال طاری ہوگیا ہے ایسے ہی اشخاص کے گرد جمع ہوتے ہیں، حالانکہ ہم اگر قرآن کی طرف رجوع کریں تو معلوم ہوگا کہ اولیاء کے ساتھ حسن عقیدت اور ان کی تصدیق کوئی شرعی امر نہیں ہے نیز پیغمبر اسلام نے اولیاء پر اعتقاد رکھنے کو حرام قرار دیا ہے۔

والذین اتخذوا من دونه اولیاء ما نعبدهم الا لیقربونا الی الله زلفی ان الله یحکم بینهم فیما هم فیه یختلفون

اور جن لوگوں نے اس کے سوا اوروں کو اپنا کارساز بنالیا ہے (وہ یہ کہتے ہیں کہ) ہم تو ان کی پرستش صرف اسلئے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا سے نزدیک کردیں ضرور خدائے تعالیٰ ان تمام باتوں کو جن میں وہ آپس میں اختلاف کیا کرتے ہیں فیصل فرمادے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلام اپنے ابتدائے ظہور کے وقت سوائے خدائے واحد کے اعتقاد کے کسی اور کو قبول نہیں کرتا تھا، جس طرح یہ دین اپنے ابتدائی اصول و مبادی کے ساتھ شروع ہوا تھا انہی پر باقی رہا، آج کل یہ مذہب توحید، تمام مکاتیب خیال اور مذاہب کو جامع و محیط ہے اور ہر اعتقاد اس پر منتہی ہوتا ہے؛

اسلامی خوبیوں اور محاسن میں سے یہ ہے کہ اسلام رحمت و شفقت کا

دین ہے، تقریباً ہر مومن سے بدون امتیاز رنگ و بو جنت اور آسائش عقبیٰ کا وعدہ کرتا ہے، ایک مجاہد و غازی شہید ہوتا ہے اور ایک عالم قرآن کی تلاوت پر اکتفا کرتا ہے، تو یہ دونوں خدا کے نزدیک مقبول ہیں، فقیر و گدا اللہ کے پاس بلند مرتبہ رکھتا ہے اسی طرح ایک مالدار بھی، بشرطیکہ یہ دونوں متقی اور شریف ہوں۔

پیغمبر اسلام کا نقطۂ فکر بالخصوص الوہیت کے باب میں تمام افکار و نظریات سے بالاتر تھا، لیکن بہت سے لوگوں نے انسانیت کی قدر پہچاننے میں بھول نگاری سے کام لیا، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے خود اپنے حقیقی مقاصد تک پہونچنے میں تساہل کا اظہار کیا۔

بے شک انسان کو خدا پر ایمان رکھنا اور اسی کی عبادت کرنی چاہئے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ اپنے نفس کے ساتھ جنگ کرے اور خود کو اس لیے عذاب الیم میں گرفتار کرے کہ اپنے نفس کو مقہور و مغلوب کرے اس لیے کسی انسان کو یہ سزاوار نہیں کہ وہ ایسے کمال مطلق کا طلبگار رہے جو اس کی دسترس سے باہر اور اس کے حیطۂ امکان سے بیرون ہو۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جو شخص کمال مطلق کے درجہ تک پہونچنا چاہتا ہے گویا وہ اپنے خدا کے مرتبۂ جلال کے مساوی ہونا چاہتا ہے، اور یہ بدترین اعمال اور ناجائز امیدوں میں سے ہے، پیغمبر اسلام بعض ایسی چیزوں کی طرف راغب تھے جن کی طرف عام انسانوں کا میلان پایا جاتا ہے، آپ سادہ طریقوں سے فرماتے تھے "میں تمہاری دنیا میں سے تین چیزوں کو

دوست رکھتا ہوں، عورتیں، عطر، اور نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہو سطحی بین نگاہوں میں نماز کی فضیلت و بزرگی کے بیان اور عورتوں کے میلان کے درمیان ہم آہنگی و موافقت... دشوار معلوم ہوتی ہے کہ عقل اس کو دائرۂ صواب سے خارج سمجھتی ہے، لیکن آنحضرتؐ کا یہ بلیغ جملہ کوئی مخفی معنی نہیں رکھتا بلکہ جو کچھ اس ظاہری لفظ سے سمجھا جاتا ہے وہی مقصود و مدعا ہے، جس نے اس مفہوم و معنی کو سمجھ لیا گویا اس نے اسلام کو کما حقہٗ پہچان لیا، پیغمبرِ اسلام جن چیزوں کے دلدادہ تھے مسلمانوں کو بھی یہی دلدادگی اور میلان پیغمبر سے ورثہ میں ملا ہے؛

نماز مسلمانوں کے دلوں میں ایک بلند مرتبہ رکھتی ہے، یہ عبارت عورتوں اور بچوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے جیسا کہ عیسائیوں کے یہاں خصوصی حیثیت رکھتی ہے، بلکہ یہ نماز مردوں کے مزایا و خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے اور عورتوں پر ان کے افضل ہونے کا ایک رخ ہے، عورتوں اور بچوں پر نماز کی مواظبت اور اس کا تسلسل فرض نہیں ہے، اس لیے کہ نماز مسلمانوں کے نزدیک ان عظیم الشان امور میں سے ہے جو مردِ کامل کے صفات کا لازمہ ہیں؛

اس کے باوجود بعض ایسے خواہشات و لذات ہیں کہ جن کو پیغمبرِ اسلام نے منع کیا ہے، اور حکم دیا ہے کہ مجاہدۂ نفس اور ریاضتِ بدن کے ذریعہ ان کو ترک کیا جائے، مسلمانوں پر شراب نوشی کو حرام قرار دیا، اسی طرح ان تمام مشروبات سے باز رکھا جن میں شراب کا اثر پایا جائے، مسلمانوں نے اس حکم پر سختی سے

عمل درآمد کیا اور اِس ممنوعہ شئے پر عمل پیرا ہو کر ملّتِ اسلامیہ مرضِ مسکرات سے
نجات پائی ہوئی ہے، مسکرات ایک ایسی آفت ہے جو اکثر عیسائی قوموں کو
رنج و مصیبت میں گرفتار کئے ہوئے ہے، یہ اجتماعِ انسانی کو اضطراب میں
ڈالنے اور دُنیا کو تباہ و برباد کر دینے والے اسباب میں سے ایک سبب ہے
جس سے ملّتِ اسلامیہ بے خبر ہے۔

اِسلام نے اپنے احکام و تعلیمات کے ذریعہ دُنیا کے ایک بڑے حصہ کو
اپنی طرف جذب کر لیا، وہ اِنسانی نفوس کو تصورِ ذاتِ الٰہی کی بدولت اور اُن
صفات کے تخیل کے واسطے سے جو انسانی صفات سے ماوراء ہیں، بلند سطح تک
لے جاتا ہے، ہر روز پنج وقتہ نمازوں میں اُن صفاتِ الٰہی کو یاد دلاتا ہے، اِسلام
اِنسانی طبیعت و فطرت کے عین موافق ہے، اِس لیے کہ اس نے اِنسانی
زندگی کے اکثر شعبوں کو جن کی طرف بنی نوعِ اِنسان کا فطری میلان ہے تجویز
کیا ہے، اِسلام کے پھیلنے کا اہم ترین عنصر بالخصوص سیاہ فام قوموں کے پاس
مذہب کی سادگی اور اسلامی تعلیمات کی بساطت ہے، یہی سادگی و بساطت خود
قرآن کا طرۂ اِمتیاز ہے، بدین وجہ قرآن اُن وحشی و جاہل اِنسانوں کی طبیعت
کے ساتھ جو اِسلام کے قبل کسی دین و مذہب سے نا آشنا تھے نہایت موافق ہے
اِسلام ایسا دین ہے جس میں اسرار و رموز نہیں ہیں، سکرات کے وقت
کلمۂ شہادت کے بجائے صرف اِشارہ جو کلمۂ اِسلامی پر دلالت کرے، مثلاً
وحدانیتِ خدا کی طرف اِشارہ کرنے کے لیے انگشتِ شہادت کا آسمان کی طرف
اُٹھانا کافی ہے، اگر کوئی جاہل اِنسان اپنے سامنے دو مذہب دیکھے جن

وحدانیت خدا اور بقاء روح ان دو حقیقتوں میں باہمی متحد ہوں جیسا کہ یہ دونوں مذاہب اسلام اور عیسائیت ہیں، تو وہ ایسے مذہب کو اختیار کرے گا جس میں اُن دو حقیقتوں سے بڑھ کر اور کوئی شئے نہیں ہوگی، لامحالہ اُسے اسلام ہی انتخاب کرنا پڑے گا، یہی وہ قوت ہے جس کے ذریعہ قرآن نشر و اشاعت کے سلسلہ میں مسیحیت پر تفوق و برتری رکھتا ہے، یہ قوت کارکردگی تیرھویں صدی میں عالم آشکارا تھی، یہی وجہ ہے کہ پوپ مارداشی کی کتاب "تردید القرآن" میں جو قرآن کے رد میں لکھی گئی ہے، ہم یہ الفاظ پڑھتے ہیں "قارئین کے ذہن سے یہ حقیقت اوجھل نہ ہونے پائے کہ یہ سرکش یا الم انگیز گروہ یا جو بھی نام تم چاہو اس کا رکھ لو، اس نے عیسائیت میں جو ظاہری، کھلم کھلا، روشن اور مصدقہ امور تھے ان تمام کو پیش نظر رکھا اور اُن پر ایسے امور اضافہ کر لیئے جو نظام عالم کے مطابق اور دنیوی نشو و ارتقاء کے قانون کے موافق تھے، اس دین کی نگاہوں سے انجیل کے وہ معمے دور ہو گئے جو ابتداءً ہماری نظر میں غلط ہیں اور اُن کا عقل ادراک نہیں کرتی ہے، اسی طرح قوانین اسلام ہی نوع انسان کی تنگئ حیات کے ان تمام اسباب و دواعی سے عاری ہیں جو کتاب انجیل میں پائے جاتے ہیں، اس طرح اس نے دو دشوار گذار گھاٹیوں کو جن کو ہر شخص جانتا ہے کہ یہ انسان اور دین حق کی راہ میں حائل ہیں، ہموار کر دیا، یہ دونوں دشوار گذار مقامات مقام روح اور مرحلہ بدن ہیں، یہی وجہ ہے کہ بت پرست قومیں موجودہ دور میں اپنے دین سے دست بردار ہو جانا چاہتی ہیں اور اس کے

بجائے دین اسلام کو قبول کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں، کہ مذہب عیسائیت کو۔

مبلغین اسلام ایک اور مسئلہ توضیح طلب باقی رہ گیا ہے وہ یہ کہ ہم اُن اسباب و وسائل کو ذکر کر دینا چاہتے ہیں جو آج کل اسلام کی اشاعت و تبلیغ کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ اس مقام پر بھی ہم اسلامی تبلیغ و ترویج کے ایک اہم ترین سبب کا مشاہدہ کرتے ہیں، جن اشخاص نے علم اسلام کو بلند کیا ہے وہ عام طور سے اس ملک کے تجارت پیشہ لوگ ہیں جو دور دراز ممالک سے طلب روزگار میں سفر کیا کرتے ہیں، اس لحاظ سے مبلغ اسلامی یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ مبلغ کا لفظ مسلمانوں کے نزدیک صحیح نہیں ہے اس لیے کہ مسلمان عیسائیوں کی طرح کوئی جمعیت نہیں رکھتے جن کا مشغلہ تبلیغ و دعوت دین ہو) جاہل قوموں کے نزدیک خوف و دہشت کا موجب نہیں ہے جیسا کہ یہ قومیں عیسائی مبلغین سے خوف و دہشت کھایا کرتی ہیں، یہ قومیں بقول موسیو مونیٹی جلد بگوش اسلام ہوتی ہیں، اس لیے کہ جن قوموں کو اسلام کی دعوت نہیں پہنچی، وہ زیادہ تر بچوں کے مشابہ ہیں اُن کے سامنے جو کچھ پیش کیا جاتا ہے اُن سے یہ اعراض کر لیتے ہیں، جن چیزوں کے خیال سے اُن کو روکا اور باز رکھا جاتا ہے انہی کی طرف اُن کو زیادہ رغبت اور خواہش ہوتی ہے اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے جو راہیں ہموار ہوتی ہیں وہ بے شمار اور گوناگوں ہیں، سب سے بہتر مقام جس کو ہم تلاش کر سکتے ہیں وہ خط استواء کے قریب فرانسیسی جاگیروں کے نزدیک افریقہ کے خطے ہیں، اس مقام سے

بہتر کوئی اور سمت نہیں جہاں اسلامی ترقی اور پیش قدمی کا مشاہدہ ہوتا ہو۔
جو لوگ تبلیغ و اقامت دین کا کام انجام دیا کرتے ہیں اُن کو "فولبہ"
یا "فولبوسین" کہا جاتا ہے، یہ سوڈان میں ایک سفید فام نسل کے لوگ ہیں،
یہ لوگ اپنے غیروں پر فوقیت و اولیت رکھتے ہیں، اسلام اُن کے دل
کی گہرائیوں میں اُتر چکا ہے، ہم نے جہاں کہا ہے کہ اسلام کے دو سرچشموں میں
سے ایک نہر شاد کے اقالیم ہیں، وہاں اُن ہی کی طرف اشارہ کیا گیا تھا، فرانسیسی
محققین نے اُن کو شادی اور لوغونز میں دیکھا ہے، فولبوسین کا مقصد
اسلام کی نشر و اشاعت اور تجارت کے دائرہ کو وسیع و عظیم تر کرنا ہے، اس
کے علاوہ ایک اور مقصد ان کا ہے وہ یہ کہ سلطنت و اقتدار کے دائرہ کو
وسیع کیا جائے، اس لحاظ سے وہ بھی اہل یورپ کی طرح کارگاہِ عمل میں سیاسی
مقاصد رکھتے ہیں، جن کے لیے افریقہ میں کام کر رہے ہیں، موسیو مسترانؔ
کہتا ہے کہ "جس وقت ہم جہاتِ شادی میں آئے سب سے پہلے جو چیز
ہمارے ذہن میں سماگئی یہاں کا سیاسی نظام تھا جس کو سلاطین اسلام
نے اپنی محکوم قوموں کے درمیان ایجاد کرنے کی کوشش کی ہے، بہت سے
قبائل فولبوسین سے میل جول زیادہ رکھتے ہیں اُن قبائل کو خواصہ کہتے
ہیں، یہ سفید فام نسل ہیں، اور نئے نئے مسلمان ہیں، اُن کا درجہ و مقام
کمتر ہے، فولبوسین کے مقابلہ میں یہ لوگ ایسے ہی ہیں جیسے کہ عربوں کے
مقابلہ میں یہودی، ہم نے اُن کو یہودیوں کے مشابہ اس لیے قرار دیا ہے
کہ جمیع سیاحان و محققین یورپ نے یہی تشبیہ پیش کی ہے، اس لحاظ سے

خواصہ جفاکش قوم ہیں لیکن دولت پسند یہودیوں کی طرح زبانی حال کسب معاش کے راستے بخوبی ہموار کر لیتے اور اپنی تجارت کو معرض خطر میں نہیں ڈالتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ فولبوس کے پیچھے پیچھے نقل و حرکت کرتے ہیں، فولبوس جنگجو اور صاحب فتوحات ہے، اس وقت تک آرام و سکون سے نہیں بیٹھتا جب تک کہ امن وامان اور استقلال نہ پیدا کرے، خواصہ سوڈان میں معارف و علوم کے مالک ہیں، حتیٰ کہ انھوں نے علوم و فنون کے خزانے جمع کر رکھے ہیں، لیکن ان کا علم نوشت و خواند ہی پر منحصر ہے، یہی بت پرستوں کے اندر نفوذ پذیر ہونے کے لیے کافی ہے، اس لیے کہ یہ لوگ پڑھے لکھے شخص کو بڑا سمجھتے ہیں اور تقریباً اس کی پوجا کرنے لگتے ہیں، اس کے باوجود خواصہ کا مقام ان کے حاکموں (فولبوس) کی نظر میں پست ہے، فولبوسین درحقیقت حامیان اسلام ہیں اور خواصہ واعظوں اور فقیہوں کے قائم مقام۔

بعض لوگ فولبوسین کے مذہبی و سیاسی وسیع اقتدار کو اس امر کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ یہ لوگ ان خصومتوں اور فیصلوں میں جو ان کے ہمسایہ بت پرست قبائل کے مابین واقع ہو جاتے ہیں مداخلت کرتے ہیں، جہاں کہیں باشندگان شہر میں کوئی جھگڑا یا تنازع واقع ہو یہ وہاں پہنچ جاتے اور اس کا فیصلہ کرتے ہیں، لیکن جن مقامات میں بت پرست قبائل متحد ہیں اور نزاع و خصومت ان کے درمیان کم ہے وہاں فولبوسین مذہب و سیاست کے ذریعہ دخل نہیں دیتے، یہ وسیلہ اپنے لیے اس وقت

پیدا کر لیتے ہیں، جبکہ مسلمانوں کے محلہ میں قتل و غارت کے واقعات پیدا ہو جاتے ہیں تو یہ اس موقعہ پر نقصان کی تلافی کرنے اور انتقام کی خاطر اپنی جماعت روانہ کرتے ہیں یہی سبب ہے کہ یہاں اسلام پھیل جاتا اور ان مبلغین کا تسلط قائم ہو جاتا ہے، بہرحال ان کی مداخلت کے اسباب مختلف نوع کے ہوتے ہیں، ان کا طریقہ سیاست ان گوناگوں موقعہ پر اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے اندر سیاسی دور اندیشی اور کافی قوت و اقتدار موجود ہے۔ اس سیاست کا اصلی سرچشمہ میدا و حمایت ہے جو وحشی قوموں کے درمیان مقرر کر چکے ہیں، جیسا کہ موسیو مسٹر بیان کرتا ہے، جو شخص ان کے پاس پناہ گزیں ہو جاتا ہے وہ مامون و محفوظ ہو جاتا ہے، جو شخص ان کے دائرہ اطاعت سے بیرون ہو جاتا ہے وہ معرض خطر میں ہوتا ہے، جب کبھی کوئی قبیلہ ان کے پاس پناہ گیر ہو جاتا ہے تو اس قبیلہ کے رؤسا، سوڈان کے مسلمان بادشاہوں کے پاس جاتے ہیں، ملوک اسلام ان کو عہدوں پر فائز کرتے، ان کو انعام و اکرام سے سرفراز کرتے اور ان کے وطنوں کو واپس بھیج دیا کرتے ہیں، وہاں یہ لوگ مسلمان سلاطین کے نام سے ان کی زیر حمایت حکومت کرتے ہیں، اگر قبیلہ یا دیہات بڑا ہو تو سلطان اپنی جانب سے ایک سفیر ان کے پاس روانہ کرتا ہے کہ ان کی حکومت سلطان کی نیابت میں قائم ہو، سلطان کے تمام سفراء خواصہ میں سے ہوتے ہیں جو حکام کے پہلو بہ پہلو مستشار کے خطاب سے بیٹھتے ہیں، ان کو وسیع اختیار و اقتدار حاصل ہے، قرآن سے انہوں نے جو احکام و

معلومات حاصل کی ہیں اُس کی وجہ سے اُن کو قضا و عدالت کا اہل گردانا گیا ہے وہ اس اہلیت کی بنا پر جو اشخاص اُن کے پاس پناہ لینے آتے ہیں اُن کی منفعت کے مطابق حکم کرتے ہیں، یہ ایک جھنڈے کی مثال ہیں، سوڈان سے جو تجار آتے ہیں اُن ہی کے ارد گرد جمع ہوتے ہیں، کبھی ایسا اتفاق پیش آتا ہے کہ بعض بُت پرست قبائل ابتداءً فولبوسین کے مطیع و منقاد نہیں ہوتے، اس وقت فولبوس اُن پر حملہ کرتے اور روسا قبیلہ کے بچوں کو گرفتار کر کے سوڈان روانہ کر دیتے ہیں تاکہ اپنے اصول و قوانین اور خواص کے مبادی و مقدمات کے مطابق اُن کی تربیت کی جائے، ایک مدت کے بعد اُن کو اُن کے شہروں کی طرف بھیج دیا جاتا ہے، یہاں یہ لوگ فولبوسین کے جانشین ہو جاتے ہیں، جیسا کہ یورپی ممالک حکام کو اپنی نوآبادیوں میں بھیجا کرتے ہیں، اس اثناء میں میل جول، معاشرت اور جذبۂ تقلید کی بدولت اسلام بغیر کسی جبر و اکراہ اور بلا تعین مبلغین دسفر اور پھیل جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بت پرست محض اس لیے کہ کسی خواص سے ایک کپڑا خریدے اور بدن ڈھانپنے نماز میں فروخت کنندہ کی تقلید بندر کی طرح شروع کر دیتا ہے، اُن لمحات کو بیان کرنا مشکل ہے جن میں وہ حقیقی مسلمان ہوتا ہے، اس لیے کہ اسلام ایک تدریجی مشق ہے، جس وقت کسی شہر میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو جائے فولبوسین وہاں ایسے مدارس قائم کرتے ہیں جن میں خواص اپنے تعلیمی و تدریسی فرائض انجام دیتے ہیں، لیکن میل جول کے ذریعہ بالقصد باقی باشندگانِ شہر میں اسلام کی نشر و اشاعت نہیں کرتے بلکہ یہ کام

خواصہ یا خود اہالی شہر کے تحویل کر دیا جاتا ہے، اسلام کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں منجملہ اور وسائل کے جو فوبوسین کے ہاتھوں میں ہیں آپس میں شادی بیاہ کا لین دین ہے، اس لیے کہ سلاطینِ سوڈان بت پرست خاندانوں سے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے شادی کرتے ہیں۔ بہت کم عرصہ میں ان کی عورتیں اور اولاد دینِ اسلام کی ترویج و ترقی کے لیے قوی اسباب بن جاتے ہیں، موسیو رینان اپنی بعض کتابوں میں اسی مقصد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:۔

"جس وقت کسی شخص کے سامنے سے عورتیں
اور بچے گذر رہے ہوں اور اپنے ہاتھ اس کی طرف
دراز کئے اس سے یہ خواہش کریں کہ ہم جس چیز
کے معتقد ہیں تو بھی اسی کا اعتقاد رکھ، اس موقعہ
پر اس شخص کے لیے بہرا ہو جانا سخت دشوار ہے"

علاوہ بریں شادی بیاہ کا لین دین اسلام کے اوّلین حامیوں کا سبب تھا، پیغمبرِ اسلام نے خدمتِ دین کی خاطر نہ کہ خواہشاتِ نفسانی کے لیے بہت سی شادیاں کیں، اس کی آپ نے تصریح فرمائی کہ مسلمانوں پر جو محدود شادیاں مقرر کی گئی ہیں اس کے خلاف خدا نے آپ کو دس عورتیں جائز قرار دیں، جس شخص کو امور و مصالح میں دقتِ نظری حاصل ہے وہ اس اختصاص کی علت و غایت کو معلوم کر سکتا ہے اس لیے کہ پیغمبرِ اسلام نے پچیس سال تک کوئی شادی نہ کی، چالیس سال کی عمر میں حضرت خدیجہ سے

جو بیوہ ہو چکی تھیں شادی کی، اُن سے اولاد پیدا ہوئی، اس دوران میں تعدد زوجات کی طرف جس کا رواج عربوں میں اسلام کے قبل تھا اور جس کو بعد از اسلام قرآن نے جائز قرار دیا، مائل نہ ہوئے کوئی لونڈی بھی نہ رکھی، حضرت خدیجہ نے ۶۱۹ء میں وفات پائی، اس کے بعد آنحضرت بارہ سال زندہ رہے، اس مدت کے دوران میں آپ نے دس شادیاں کیں جن میں سے صرف دو بیویاں کنواری تھیں، اور باقی یا مطلقہ تھیں یا بیوہ، رودلان کہتا ہے۔

> "کثرت ازدواج آنحضرت کی تعلیمات اور آپ کے خیالات کو زیادہ ترواج کرنے کا موجب تھی، اس قسم کا عقیدہ رکھنے والے کا مقصد رد و قدح کرنا ہے لیکن یہ قول اس امر کی دلیل ہے کہ پیغمبر علیہ السلام نے جو بکثرت شادیاں کیں وہ شہوت کی غرض سے نہ تھیں۔"

اشاعت اسلام کے لیے الٰہی اسباب | مذکورہ بالا اسباب اشاعت اسلام کے لیے اہم ترین حیثیت رکھتے ہیں، ہمیں نہیں معلوم کہ اس دین کے پھیلنے کا راز سمجھنے کے لیے یہی اسباب کافی ہیں یا آسمانی اسباب کی بھی جستجو کرنی پڑے گی، صرف یہی ایک آسمانی سبب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اولاد اسماعیل کے ذریعہ ظہور پذیر ہوا اور کرہ ارض میں سرایت کر گیا، جیسا کہ عیسائیت اولاد اسحاق کے ذریعہ منظر عام پر آئی، خدا نے اولاد کثیر میں اسی طرح برکت عطا کی، جیسا کہ اللہ وعدہ فرما

ہم جانتے ہیں کہ یہوداہ نے حضرت ابراہیمؑ سے اسماعیلؑ کے حق میں کہا تھا عن قریب خدائے تعالیٰ اسماعیل میں برکت دے گا اور اس کی نسل کو بڑھا دے گا، اس مفہوم کو اس عبارت کے ذریعہ دوبارہ اس طرح ذکر کیا کہ خداوند اولادِ کنیز میں برکت دے گا، اور اس کی نسل سے ایک عظیم الشان امت کو ظہور میں لائے گا، صرف اس لیے کہ وہ تیری اولاد سے ہے، یہوداہ نے اس بشارت کو تیسری مرتبہ بھی اعادہ کیا ہے۔

ایک لختِ جگر کا بیابان میں پیاس سے بلبلانا اور ہاجرہ کے سامنے ایک فرشتہ کا ظہور پذیر ہونا ایک دلکش روایت ہے، پھر بے آب و گیاہ صحرا کا بیان اور ماں کا اپنے فرزندِ دلبند پر ترس کھانا ایک لطافت خیز داستان ہے جو اس طرح بیان کی جاتی ہے۔

> "پانی مشکیزہ میں خشک ہو گیا، ہاجرہ نے لختِ جگر کو ایک درخت کے نیچے ڈال دیا کچھ دور گئی، ایک تیر انداز کی مسافت کے مطابق بچہ کے روبرو بیٹھ گئی اور کہا میں اپنے بچہ کو پیاس سے بلبلا کر مرتے ہوئے دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتی اس کے بعد زور زور سے رونا شروع کیا، اس سے پہلے بچہ کے رونے کی آواز آسمان پر بلند ہو چکی تھی، اس کے بعد خدا کی طرف سے ایک فرشتہ ظاہر ہوا اور ہاجرہ سے کہا اے ہاجرہ! تجھے کیا ہو گیا ہے، گھبرا نہیں،

جس جگہ تو نے بچہ کو چھوڑا ہے وہیں سے خدا نے
اُس کی آواز سن لی، اٹھ اور اس کی مدد کر اٹھ
تیرے بازو اس کو اٹھانے کے لیے توی ہونا چاہئے
عن قریب اس بچہ کی نسل سے ایک عظیم الشان
امت موجود ہو گی۔"

جس وقت میں نے اپنا ہاتھ کتاب مقدس کی نقاب افگنی کر کے ان آیات کو، جنھیں میں نے لکھا ہے، نقل کرنے کے لیے دراز کیا، اس پر لرزہ طاری ہو گیا، اگر بقول پوپ بروغلے یہ بات نہ ہوتی کہ اسلام کی ترقی اور اس کی ترویج مسلمانوں کے باپ کی بشارتوں کے تحت مندرج ہے تو میں ان آیات کو اسلام پر چسپاں کرنے کی جرأت نہ کرتا اور میں اس بات کا قائل ہی نہ ہوتا کہ اس دین کی نشر و اشاعت میں کوئی ربانی راز پوشیدہ ہے۔

باب ہفتم

الجزائر میں اسلام

عیسائیت قبول کرنے سے مسلمانوں کا انکار ہم نے مشاہدہ کرلیا کہ اسلام چونکہ وسط افریقہ میں بت پرست قوموں کو اپنی طرف جذب کرکے انہی میں سے قرآنی جھنڈے کے تحت فوجیں تشکیل دیتا ہے اس لیے وہ اپنی قوت وحیات کو اپنے اوپر دلیل و برہان ٹھہراتا ہے، نیز بلاد حبش کے شمال مشرقی خطوں اور بالائی مصر سوڈان میں اپنے اندر حیرت انگیز قوت اور عجیب و غریب رفتار رکھتا ہے، اس لیے کہ دو طاقتور حکومتیں جو مملکت مہدی اور مملکت امام جغبوب کے نام سے عبارت ہیں، پچاس سال پیشتر سے اب تک اس دینی حکومت کی ہیئت میں قائم ہیں جس کو پیغمبر علیہ السلام نے تشکیل دی تھی، نیز ان دو مملکتوں کے مقابلہ میں انہی کے طریقہ کی شمالی افریقہ میں ایک

تیسری مملکت ہے جو مسلسل عیسائیت کا مقابلہ کرتی ہے اور اس پر غالب ہے۔ مملکت سویم سے ہمارا مقصد مملکت مراکش ہے، اگرچہ یہاں کے بلاد میں رہنے والے بعض قبائل جو اس بادشاہ کے زیر حکومت ہیں وہ اس کی سلطنت کو پورے طور پر تسلیم نہیں کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان ممالک میں کوئی حادثہ رونما ہوجائے تو بلاشبہ یہ قبائل تمام مغرب اقصیٰ میں غلبۂ اسلام کی حمایت کرینگے ہم قرآنی قواعد وضوابط کے مطابق جو سلطنت دینی اور سلطنت سیاسی ایک حاکم کے قبضہ میں ہے ان دونوں مملکتوں کے حال سے بحث نہیں کرتے ہیں، یہ وہ ممتاز ممالک ہیں جن کو موحدین مکہ نے دارالسلام کے نام کیلئے نگاہ میں رکھا ہے، اسی نام کی طرف مصر اور ترکی مائل ہیں، لیکن یہ نام اُن کو نصیب نہ ہوگا، کیونکہ یہاں مغربی تمدن نے مذہب کے صاف شفاف چشمہ کو گدلا کردیا ہے، بلکہ ہم الجزائر اور ہمارے اُن افریقیائی ممالک میں اسلام کے داخلہ اور اس کے احوال بیان کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں جہاں عیسائیت اور مسیحی حکومت دینِ اسلام کے ساتھ مزاحمت کرتے ہیں، یہ وہ ممالک ہیں جن کو مسلمانوں نے اسلام میں دارالحرب یعنی دارالجہاد کا نام دے رکھا ہے یہاں اسلام کی تلاش وجستجو حسب ذیل تین امور کی بنا پر دور رکھتی ہے آیا انجیل نے قرآن میں کچھ تغیر وتبدل کیا ہے یا نہیں، اگر بالفرض اسلام محفوظ ہے تو آیا مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان کوئی ایسا اتحاد و تقرب پیدا ہوگیا ہے جو آئندہ امتزاج کلی کے حصول کا موجب ہوگا یا نہیں، آیا جہاد یعنی مسلمانوں کا مسیحی حاکموں کے دائرۂ اطاعت سے باہر نکل جانیکی

ایسی توقع ہے کہ جس سے ان ممالک کو فتح کرنے کی دھمکی دی جا سکے؟ یا نہیں، مگر مسلمانوں میں سے کوئی ایسا پیدا نہیں ہوتا کہ جو دین اسلام کو چھوڑ کر دوسرا دین قبول کرے، اس قسم کا خیال و تصور مسلمانوں سے کوسوں دور ہے حتیٰ کہ یہ بھی کوئی ایسا لفظ پیدا نہیں کرتے ہیں جو اس شخص کی صفات کی تعبیر کر سکے جو اس کام کو انجام دیتا ہے جیسا کہ یہ لوگ اُن مسلمانوں کی توصیف میں جو فرانسیسی قومیت اختیار کر چکے ہیں متحیر ہیں، اس لیے کہ فرانسیسی قومیت کے سانچے میں ڈھل جانا ایک قسم کا ارتداد ہے، اس بنا پر لامحالہ فرانسیسی ڈکشنری کے الفاظ سے ایک لفظ کا اُن پر اطلاق کر کے کہتے ہیں متنوری یعنی مذہبی شعائر سے منقلب۔

کسی انسان کے لیے ایک ایسے مسلمان کی حالت و کیفیت کو بیان کرنا جس کو کوئی مسیحی عیسائی بنانے کا ارادہ کرے، نہایت مشکل ہے، حتیٰ کہ اگر ہم اُس کو مسیحی متنوری (مرتد) سے تشبیہ دیں جس کو ایک بت پرست بتوں کی پوجا کی طرف مائل کرنا چاہتا ہو تو یہ تشبیہ ناقص ہو گی، عیسائیت قبول کرنے سے مسلمانوں کے اس درجہ شدید انکار کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان عیسائیوں کو حقیر سمجھتے ہیں اور اس بات پر خوش اور رضامند ہیں کہ وہ موحدین میں سے ہیں، بعض مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اُن کا دین مذہب عیسائیت پر اس حد تک ترجیح رکھتا ہے کہ ناممکن ہے کہ عیسائیوں کو دین اسلام کی صحت و درستی پر یقین و اذعان نہ ہوتا ہو، حتیٰ کہ اُن کے ساتھ جاری مصالحت اور رواداری کو وہ اس ترجیح کا ضمنی اعتراف شمار کرتے ہیں،

دوسرا پہلو یہ ہے کہ مسلمان خدا کی عبادت دل سے کرتے ہیں، اُن کا مذہب خارجی علامات و اسباب نہیں رکھتا، یہ لوگ عیسائیوں کی عبادت کے رسوم اور طریقوں کو ایک طرح کی بت پرستی جانتے ہیں، اصحاب انجیل کو اہل کتاب سے نامزد کرتے ہیں، لیکن ان کو وہ مسلمانوں کا ہم رتبہ قرار نہیں دیتے، بلکہ اُن میں سے بہت سے مسلمان عیسائیوں کو بت پرستوں سے بڑھ کر اپنا دشمن سمجھتے ہیں، اس لیے کہ عیسائیوں نے اس دین کو جسے خدا نے اُن پر نازل کیا ہے معلوم کرنے کے باوجود اس کے اندر تحریف و تبدیلی پیدا کر دی ہے۔

یہ ہیں مسلمانوں کے افکار و خیالات مذہب عیسائیت کے متعلق ظاہر ہے کہ یہ افکار سب سے بڑی رکاوٹ ہیں جو عیسائیت کی نشر و اشاعت کی راہ میں حائل ہوتے ہیں، مسیحی مبلغین جہاں بھی گئے ہیں مختلف قوموں عام اس سے کہ وہ وحشی ہوں یا متمدن، عیسائی بنانے میں پیش قدمی کر چکے ہیں، اپنے راستہ میں جو بھی شہر اُن کو نظر آیا وہاں اُتر پڑے اور یہاں کے تمام باشندوں پر فتح کے وہ تمام دروازے بند کر ڈالے، جن کو مسلمانوں کی طرف سے مشاہدہ کیا، اس لیے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ متمدن بت پرست قومیں اپنے وحشی دین کو اس غرض سے چھوڑ بیٹھیں کہ وہ اُن کی موجودہ ترقی یافتہ عقول و اذہان کے موافق نہیں ہے، پھر اُن کا تمدن اور اُن کی تہذیب اس امر کی تائید کرتی ہے کہ خالص معقولات کو حاصل کریں اس بنا پر مسلمانوں کے لیے یہ آسان ہو جاتا ہے کہ اپنے مذہب کو منطقی بیانوں کے

نہج و اسلوب پر اُن کے سامنے پیش کریں، وہ اِس لحاظ سے اُن بُت پرست متمدن اقوام کو ناخوش کر سکتے ہیں، حتیٰ کہ مقدس پولس بذات خود بہت سے ایسے بُت پرستوں سے ملاقات کرتا تھا جو اپنے دیوتاؤں کو اِس لیے چھوڑ بیٹھے تھے کہ اُن کے کذب و دروغ کو سمجھ گئے تھے؛ بعض ایسے یونانی نظر آتے ہیں جو دلیل و براہان کے ذریعہ سے اُن امور کی طرف مائل ہو گئے ہیں وحشی بُت پرستوں کو عیسائی بنانا آسان ہے اِس لحاظ سے کہ مسیحی مبلغین علم میں اُن بُت پرستوں پر فضیلت رکھتے ہیں اور اُن کے فہم و ادراک کا درجہ بھی اُن کے مقابلہ میں اونچا ہے، لیکن کونسا مبلغ، تجربہ کار اور عالم و دانشمند ایسا ہے جو ایک مسلمان کو اس کے دین کے راستہ سے ہٹا سکے، اور ایسے مذہب کی عبادت پر آمادہ کر سکے جس کو وہ حقیر و کمزور سمجھتا ہے اور اپنے ہی دین کے اندر اپنی عظمت و مجد کا بلند مقام پاتا ہے، مبلغین کے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ مسیحیت کے خلاف ابداً آباد تک جو چیز مسلمان کے فکر و ذہن کے ریشہ ریشہ میں جاگزیں ہو چکی ہے اس کو زائل کر سکیں حالانکہ یہ مباحثہ و مناظرہ کے قابل بھی نہیں ہے۔

عیسائی یہ سوال کرتے ہیں کہ جب اسلام عیسائیت کو قبول کرنے میں دلیل و حجت کے ذریعہ تغیر پیدا کر رہا ہے تو آیا اسلام کے ساتھ زور و قوت سے جنگ کرنا ممکن ہے یا نہیں، لیکن فرانسیسیوں کے لیے جس زمانے میں وہ مسلمانوں پر غالب ہوئے یہ ممکن نہ تھا کہ اُن کو مسیحیت قبول کرنے پر زور دیا جائے، جیسا کہ شاہ شارلمان نے کیا، بلکہ کلیسا مجبوراً

خاموش رہا جیسا کہ موجودہ دور میں اس کی پابندی لازم ہو گئی ہے کہ قوموں کے درمیان مصالحت اور رواداری کے پہلو کی رعایت کی جائے، یہ منافات مبنی بر مصلحت ہے، لیکن کلیسا اس مصلحت کو مسیحیت کا ایک اصول ہونے کے لحاظ سے قبول نہیں کرتا ہے بلکہ اس کا بالکلیہ رد کرتا ہے، نیز الجزائر کے معاہدہ کے مطابق ہر قسم کا جبر و اکراہ بالخصوص مذہب کے متعلق ہمارے لیے ممنوع ہے، اس لحاظ سے اس معاہدہ میں حکومتِ فرانس پر جنرل بورمن کے توسط سے یہ امر لازم گردانا گیا ہے کہ حکومت اپنی رعایا کے عرب کے مذہب کو محفوظ کرے گی اور اس کا احترام کرے گی، قریب تھا کہ ۱۸۶۸ء میں اس معاہدہ کی خلاف ورزی ہو جائے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ الجزائر کے پادری کا مذہبی جوش بڑھ گیا اس نے مسلمانوں کی کثیر تعداد کو عیسائی بنانا چاہا، اس لیے جب الجزائر میں شدید قحط کا دور دورہ ہو گیا تھا اس نے مسلمانوں کے بے شمار بچوں کو جمع کر کے بپتسمہ کا غسل دیا لیکن جنرل مکماھون وہاں کے حاکم بلاد نے مداخلت کی اور اس کام کو فرانسیسی معاہدہ کے خلاف قرار دے کر باطل کر دیا، یہ ایک عجیب متضاد امر ہے کہ آج الجزائر میں بعض ایسے مصنفین ہیں جو اس طرز عمل کو چھوڑ دینے پر دستِ حسرت ملتے ہیں اگر یہی مصنفین اپنے پائے تخت میں ہوتے تو ان اشخاص کی صف میں داخل ہو جاتے جو تمام سے بڑھ کر آزادیِ مذاہب کے حامی ہیں گویا وہ ایک ایسی حکومت چاہتے ہیں جو ایک طرف ہدایا و تحائف اور زر کثیر خرچ کر کے مذاہب و ادیان کے درمیان

تفرقہ ڈال دیں اور دوسری طرف مسلمانوں کو جو اپنے مذہب کے پابند اور توحید پرست ہیں اپنا مذہب چھوڑ دینے پر زبردستی کریں، اگر غلبۂ فرانس کی ابتداء میں پوپ کو اختیار دیا جاتا اور ایک رئیس و سردار جو یا تو بذات خود مسیحیت کی ترویج کی طرف مائل تھا یا عورتوں کی تحریک کے ذریعہ یہ میلان رکھتا تھا، اس پادری کا ہمنوا و مددگار ہو جاتا تو یہ پادری ہر اس شخص کو جو حکومت اور اس کے حالات جدیدہ کا بدخواہ تھا اپنے ارد گرد جمع کر لیتا اور اُن کو مال و جاہ کا وعدہ دیا کرتا، تو اس صورت میں ہمارے پاس ۱۸۷۰ء میں عربوں کی ہزارہا جمعیتیں ہوتیں جو اپنے مذہب کو چھوڑ دیتے اور واقعی فرانسیسی تربیت میں پرورش پاکر فرانسیسی تہذیب و تمدن اور اس کے مذہب کے رنگ میں رنگی گئی ہوتیں۔

مسیحی مُبلغین مسلمانوں کا مسیحی مُبلغین کی تبلیغوں کے ذریعہ عیسائیت کو قبول کر لینے سے انکار کرنا اور اُن پر جبر و اکراہ کے استعمال کا ناممکن ہونا یہ دو امور ایسے ہیں جو مسلمانوں کے لیے عیسائیت قبول کر لینے کی راہ میں حائل ہیں، کیتھولکی مُبلغین وہ پہلے اشخاص ہیں جن کو اس بات کا اعتراف ہے کہ بلا واسطہ تبلیغ و دعوت سے اعراض کرنا چاہیئے لیکن اس کے باوجود وہ اپنی دعوت و تبلیغ سے دست بردار نہیں ہوتے اور اس راہ میں جد و جہد کا کوئی گوشہ اُٹھا نہیں رکھتے، اسلامی استقلال و ثبات قدمی کے مقابلہ میں اُن کے عزائم اور ارادے سست نہیں ہوتے جہاں کہیں یہ فرو کش ہوتے ہیں راستہ ہموار کر لیتے ہیں، فقراء و مساکین کو

جگہ دیتے، بیماروں کی دیکھ بھال کے کاموں میں مصروف ہوجاتے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرنے لگتے ہیں، موسیو سرنیفار یا کہتا ہے کہ مسیحی مبلغین وحشیوں کے سامنے مذہب کا مسئلہ پیش نہیں کرتے، چونکہ اُن کا شمار پاپاؤں اور پادریوں میں ہوتا ہے اس لیے دور ہی سے مذہب کی تخم پاشی کرتے جاتے ہیں، گو اُن کے اندر مسیحی مذہب کو عربوں کے درمیان رائج کردینے کی طاقت نہیں ہے لیکن یہ حکومت فرانس کے اثر و اقتدار کی نشر و اشاعت کا بہترین وسیلہ ہیں، اگر حکومت اُن کی حمایت نہیں کرتی اور اُن سے سلسلہ کنارہ کشی اختیار کرتی ہے تو سخت غلطی کرتی ہے کیونکہ اُنھوں نے اپنی تمام عمر خدمت دین میں صرف کی ہے، اس کے باوجود اُنھوں نے مجبوراً اپنے وجدان وضمیر کی مخالفت کرکے فرانس کے فائدہ کی خاطر کام کیا ہے، یہ زمانہ گذشتہ کی اصلاح کا محل نہیں ہے، حکومت برطانیہ کی طرف سے اُنھوں نے قبائل کے درمیان پروٹسٹنٹوں کو مبلغ بنا کر بھیجا ہے، یہ وہاں ہماری حکومت کے زیر سایہ جمع ہوتے ہیں، جن ملکوں کو ہماری فوجوں نے متعدد بار فتح کیا ہے وہاں حکومت برطانیہ اپنی رعایا کے ذریعہ سے توراۃ بھیجدیتی ہے اسی طرح وہ تمام مقبوضات میں روانہ کرتی ہے بالخصوص ہر اُس مقام پر یہ کام انجام دیتی ہے جہاں فرانس کے نفوذ و اقتدار سے خائف ہے؛

جمعیات اسلامی اسلام الجزائر میں کامل طور پر صحیح سالم رہا لیکن الجزائر میں اسلامی حکومت کے زیر سایہ ایک ایسی سلطنت

تھی جو اسلام کی معتقد نہ تھی، اُس نے اپنے بغض و نفرت کے جذبات کو، جو حکومت کے بارے میں تھے، اپنے دل میں پوشیدہ رکھا، اگر علمبرداران دین کی ایک جمعیت باشندگان الجزائر کے دلوں میں مذہبی جذبات کو متحرک نہ کرتی رہتی تو ممکن تھا کہ اسلام الجزائر میں مرور ایام پر ضعیف ہو جائے، مسلمانوں کی خفیہ جمعیتیں تھیں جو ہمیشہ تجدید و احیاء دین کے بارے میں تمام موحدین کے درمیان عموماً اور ان اقوام کے مابین خصوصاً کام کیا کرتی تھیں . . . .
. . . . جو مسیحی اقوام کے زیر اطاعت تھیں

معلوم ہے کہ اولاً عربوں کی فتوحات نے اور اس کے بعد اہل مغرب کی حکومتوں نے ایک زمانے تک افریقہ و یورپ کے ڈانڈے ملا دیئے لیکن آخر کار اسلام ان خطوں میں جبل الطارق کے گوشہ میں عزلت گزیں ہو گیا، دو براعظموں کے درمیان اتصال اہل مغرب کی شکست کی وجہ سے ۱۶۰۹ء میں منقطع ہو گیا، لوگوں نے بلاد مغرب کو اپنی پناہ گاہ اس لیے قرار دی کہ یہ قرآن کے لیے ایک محکم پناہ ہے جس تک اہل یورپ کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا اور یہ مقام مسیحیوں کے ساتھ اختلاط اور میل جول رکھنے سے دور ہے، وہ اس امر کے معتقد ہو گئے کہ اسلام عربوں کے بلاد جدیدہ میں پھیل جائے گا، نیز اس کی اگلی سی شان و شوکت اسے دوبارہ مل جائے گی، جب فرانس نے بلاد الجزائر کو فتح کیا تو اسلام کی عظمت و شوکت پارہ پارہ ہو گئی اور اسلامی افریقہ اور مسیحی یورپ کے مابین اتصالی حلقے دوبارہ پیوستہ ہو گئے اور مغربی ممالک کے دروازے ایسے دشمن کے سامنے

کھل گئے جو قرآن کے مقابلہ میں بے شمار مسلح فوجوں سے زیادہ سخت اور خطرناک
ہے، اور وہ دشمن عصرِ حاضر کا تمدن ہے، مسلمان اُن خطروں کی طرف
جو اُن کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے، متوجہ ہوئے اور انھوں نے
چاہا کہ اتحادِ دینی و جمعیتِ اسلامیہ کو برقرار کریں اور اپنے باہمی روابط و
تعلقات کو ہم آہنگ و استوار بنا لیں، مسلمانوں کے باہم جو روابط ہیں
اُن کی قوت و طاقت تمام متدین و متمدن قوموں سے زیادہ ہے،
اس لیے کہ قرآن جس طرح ایک دینی ضابطہ ہے اسی طرح وہ عمرانی، تمدنی
اور سیاسی قانون و اساس بھی ہے، اس نقطۂ فکر کی بنا پر مسلمانوں کے
نفوس میں ایک تحریک و ہیجان رونما ہوا، جس نے اِس امر کے لیے
آمادہ کر دیا کہ وہ ہر طریقہ سے عیسائیت کا مقابلہ کر سکیں اور بالخصوص تمدن
جدید کے ساتھ ایمان کے نام پر جنگ کریں، سرداریرن کہتا ہے کہ
"اس تحریکِ اسلامی کی قوت ان متعدد مذہبی انجمنوں کی طرف سے
حاصل ہوتی ہے جو اس صدی کے آغاز سے پیدا ہوئی ہیں، ان کی سرگرمیاں
تمام اکناف و اطراف میں ترقی پا گئیں، لوگوں کے دلوں میں حد درجہ
اثر پیدا کر دیا، ان انجمنوں میں ایسے مبلغین اور عقیدت مند تھے کہ جو
ان مبلغین اور ذی حیثیت اشخاص کی طرح جو حج کو جانا چاہتے ہیں، لامحدود
اسلامی و غیر اسلامی ممالک کا دورہ کرتے تھے، اور اس طرح وہ مکہ سے
جغبوب تک، جغبوب سے قسطنطنیہ بغداد سے فاس، ٹمبکٹو سے قاہرہ
قاہرہ سے خرطوم اور یہاں سے زنجبار، کلکتہ، جاوہ تک نقل و حرکت

کیا کرتے تھے، اُن میں سے بعض تاجر، منجم، طالب علم، طبیب، کاریگر، گدا، سائل، شعبدہ باز، بناوٹی مجذوب ہیں جن کے سپرد تبلیغ و اشاعت دین کا کام کیا گیا ہے، یہ تمام مقبول شخصیت رکھتے ہیں اور مسلمانوں کے درمیان اُن کو بہت بڑا مقام حاصل ہے یہ اُن کو حکومت کے خطرات اور دباؤ سے محفوظ رکھتے ہیں۔

ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اُن اسلامی جمعیتوں کا تذکرہ کریں جو چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں جیسا کہ ہر دارین نے یہ کام انجام دیا ہے، بلکہ ہم ایک ایسے سبب کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو موجودہ زمانے میں ہماری نظر میں اُن جمعیتوں کی ترویج کا موجب ہے، اس کے بعد ہم الجزائر میں اُن جمعیتوں کے مقصد پر روشنی ڈالیں گے؛

جمعیتوں کی غرض و غایت

جو مشائخ مسلمانوں کے نزدیک مشہور و معروف ہیں، اُن کا مسلمانوں پر کچھ بھی اثر نہیں، اس لیے کہ اُن کا نظریہ یہ ہے کہ عبادت یا تو ذہنی ہے یا قلبی، نہ تو یہ اعضاء و جوارح کی نقل و حرکت کی محتاج ہے اور نہ مساجد اور عبادت گاہوں کی رہین منت، ایک عجیب و غریب چیز یہ ہے کہ باوجودیکہ یہ جمعیت خالص مذہبی ہے لیکن اس کے مابین درجات کا کوئی فرق نہیں اس کے افراد بجز ایک رئیس کے کسی اور کے قائل نہیں ہیں یہ رئیس امام یعنی خلیفۂ پیغمبر ہے جو مذہبی و سیاسی حکومت و اقتدار کا سرچشمہ ہے، اس لحاظ سے ایک مبصر سہولت کے ساتھ اُس اضطراب و خلفشار کو

سمجھا جاتا ہے جو عیسائی اقوام کی فتوحات کی وجہ سے مسلمانوں میں اور . . .
ممالک اسلامی میں مغربی تمدن کے داخلہ کی بنا پر پیدا ہو گیا ہے، جس کا نتیجہ
یہ ہے کہ ایک ایسی وحدت ریاست کی کڑیاں درہم برہم ہو گئیں جس کے
تابع اسلام ہے، اسی لیے آج عام مسلمانوں کے لیے کوئی ایک امام پیدا نہیں
ہوتا ہے، البتہ سلطانِ قسطنطنیہ اپنے کو خلیفۂ رسول اللہ سمجھتا ہے اور اپنے
لیے شیخ الاسلام کا نام رکھ چھوڑا ہے مگر یہ لقب محض اعزازی خطاب ہے، اس
بادشاہ کی حکومت سے باہر کے ممالک میں کوئی شخص اس خطاب کو اس کے
لیے قبول نہیں کرتا، دول یورپ نے انتہائی جدوجہد کے ساتھ اپنے تمام
وسائل کے ذریعہ اس بادشاہ کی تذلیل و تحقیر کی کوششیں کی ہیں، لہذا اگر
یہ جمعیتیں مسلمانوں کے باہمی روابط و استحکامات کے تحفظ کی کوشش نہ کرتیں
اور ان کو ایک سرزمین اور مرزبوم میں جمع نہ کرتیں تو مسلمان بے گلہ بان
بھیڑوں کے گلہ کی طرح ہوتے، اس بیان سے آپ کو معلوم ہو گیا کہ جمعیات
اسلامی کی کثرت اور موجودہ دور میں عقیدت مندوں کی زیادتی تحفظ دین
کی ضرورت اور اتحاد عالم اسلام کی محافظت کے اقتضا پر ہے، یہ ضرورت
دیگر ممالک کی بہ نسبت الجزائر میں زیادہ ہے، اس لیے کہ فرانسیسیوں نے
الجزائر میں سرکاری طور پر ایک روحانی اسلامی جمعیت کی تشکیل کی ہے
اور اس تشکیل کا مقصد صرف ایک ہے جس کو بجز عالم خیال کے کہیں اور
وہ وہم نصیب نہ ہوا، وہ مقصد یہ تھا کہ مذہب کی آڑ میں باشندگان الجزائر میں
نفوذ پیدا کیا جائے حکومت فرانس نے اس جمعیت کے اراکین کو تنخواہیں

مقرر کیں، یہ جمعیت مسلمانوں کی نظر میں ذلیل و رسوا تھی، اگر یہ باقی رہتی تو اس کی پیہم تالیف قلبی کی وجہ سے بعض باشندے مائل ہو جاتے لیکن مذہبی آزاد جماعتوں نے اس کا مقابلہ کیا اور اس کے رتبہ کو لوگوں کے نزدیک پست کر دیا اور ان کو اپنے مقصد میں پوری کامیابی ہوئی، آج یہ حالت ہے کہ وہی حکم قابل قبول ہوتا ہے جو ان جماعتوں کے کسی ایک رئیس کی طرف سے صادر ہو، یہ رؤسا ہمیشہ زہد و ریاضت کی طرف مائل ہیں، ان کی خاص اصطلاحی تعبیریں ہیں، جن کو اگر حکومت کے عہدہ دار سُن لیں تو ان کی کوئی چیز ان کی سمجھ میں نہ آئے، یہ لوگ لوگوں کو اسی طلسم کے ذریعہ موجودہ ترقی کا مقابلہ اور تمدن حاضر کی مقاومت کے لیے انتہائی کوششوں کے ساتھ دعوت دیتے ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کے عیسائیت قبول کر لینے کی طرف سے بہت مطمئن، کیوں کہ ایسا ہونا تو ان کے نزدیک ناممکن ہے جیسا کہ ہم اوپر اس مسئلہ پر روشنی ڈال چکے ہیں، یہی وجہ ہے کہ تمام اپنے کو تمدن حاضر کے دھاروں کے خلاف چلانے کی کوشش میں مصروف ہیں، کیوں کہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ تمدن اکثر اوقات عقیدہ اور ایمانی قوت کو کمزور کر دینے کا موجب ہو جاتا ہے، یہ لوگ عیسائیت کی تحقیر و تذلیل کی روح لوگوں کے دلوں میں پھونکتے ہیں، اہل الجزائر کے دلوں کو مائل کرنے میں ہماری تمام کوششیں غیر نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہیں۔

مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی میں تغیر | الجزائر میں جمعیات اسلامی کی ترویج اور ان کی تاثیر کے باوجود آج کے

اندر اتنی قوت نہیں کہ ہیئت اجتماعیہ میں محسوس طور پر جو تغیرات وقتاً فوقتاً
رونما ہو رہے ہیں، یہ اُن کی روک تھام کر سکیں، ان تغیرات کا سبب فرانس
کا تسلط واقتدار رہا ہے جیسا کہ موسیو شاتلیہ اس مدعا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
کہتا ہے کہ "اہل الجزائر کے تین گروہ ہیں، ایک گروہ خانہ بدوش، بادیہ نشین
ہے اس کے پاس بکریاں اور مویشی ہیں، اس کا اصل خاندان عربوں سے
تعلق ہے، دوسرا گروہ جو دیہاتی ہے زراعت پیشہ ہے، بسا اوقات اس
کو قبائل کی طرف بھی منسوب کیا جاتا ہے، بعض اہل مغرب بھی اس کے اندر
داخل ہیں۔

تیسرا گروہ متمدن اور شہری ہے، اس میں تجارت پیشہ اور صناع ہیں،
یہ مسلمانوں کے مذاق پر خالص تمدن کا رنگ رکھتے ہیں، ان کا خاندان [illegible] اہل مغرب سے
[illegible] سے مخلوط ہوگیا تھا اور جس میں عرب اور قبائل کا خون
داخل ہوگیا تھا، الجزائر میں تمدن کی تاثیر ان تینوں طبقات کا لحاظ کرتے
ہوئے مختلف ہے لیکن ان میں سے ہر گروہ میں تمدن جدید کے ساتھ
میلان پیدا ہوگیا ہے، اس لحاظ سے بادیہ نشین اپنی صحرا نوردی میں تخفیف
کر کے نصف خانہ بدوش بن گئے ہیں، ان میں سے بعضوں کو یہ میلان
ہوگیا ہے کہ زیریں وبالائی زرخیز زمینوں میں کاشتکاری کریں، باشندگان
دیہات شہریوں کے اخلاق واطوار کی طرف مائل ہوگئے ہیں، شہریوں
میں ان اصحاب مناطات کے ساتھ میل جول کی وجہ سے جن کے معاشرتی
اور تجارتی تعلقات یورپ کے پیشہ وروں اور کاریگروں سے وابستہ ہیں

اور بلادِ مغرب کے باشندوں کے ساتھ لین دین میں اُن کا اعتبار قائم ہو جانے کی بدولت تمدن کا بہت کچھ اثر ہو گیا ہے، بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ جو عرب شہر میں مقیم ہوتے ہیں وہ تمدن یورپ سے رذائل و معائب کو حاصل کر کے احکام و اوامر قرآن کی مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے اور منکرات کو استعمال کرنے کے مرتکب ہو جاتے ہیں، غالباً شراب نوشی اور حرام غذاؤں کے استعمال کرنے میں افراط کر جاتے ہیں لیکن خنزیر کا گوشت استعمال نہیں کرتے کیونکہ فطری طور پر اس سے وہ متنفر ہیں، اس کے باوجود قرآن مجید کے بعض احکام کی حد درجہ نگرانی اور حفاظت کرتے ہیں، مثلاً روزۂ ماہ رمضان کی پابندی کرتے ہیں حتیٰ کہ رنڈیاں بھی اپنے قحبہ خانوں میں روزہ رکھتی ہیں۔

اِن تمام تغیرات کے باوجود آثارِ تمدن ایک مسلمان کے دلی عقیدہ کو سُست اور کمزور نہیں کر سکے ہیں، اگرچہ عملی طور پر تمام قرآنی اوامر و احکام فی الجملہ متزلزل ہو گئے ہیں لیکن اُن کا ایمان ہنوز بہ تمام و کمال باقی ہے، بخلاف اس کے موسیو شاتلیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ جو مسلمان ایمان نہیں رکھتے اور فرائض و واجبات اسلامی کی پابندی نہیں کرتے ہیں بلاد الجزائر میں اُن کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے، ہمارے خیال میں موصوف کا یہ قول ترک واجبات کے بارے میں درست ہے لیکن معتقدات کی کمزوری کی نسبت خلاف واقعہ ہے، کوئی مسلمان ایسا نہیں جو اپنے عقیدہ سے بے پروا ہو، ممکن ہے کہ وہ تمام فرائض و واجبات کو چھوڑ دے لیکن اُس کا اعتقاد

بہتر ہے۔ اسلام میں یہ مسئلہ درست ہے کہ کوئی شخص قرآنی احکام و اوامر پر عمل نہ کرے تب بھی وہ مسلمان رہتا ہے۔[1]

میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ میرا یہ اعتقاد نہیں ہے کہ جو تغیر و تبدل باشندگانِ الجزائر کے حالات میں ہو چکا ہے جیسا کہ میں نے اوپر تشریح کی ہے، یہ اُن کے لیے ترقی اور پیش قدمی کا موجب ہو، نیز یہ کہ اُن کے اخلاق بہتر اور ان کی زندگی میں وسعت پیدا ہو گئی ہو اور بالخصوص مسیحیوں کی نسبت اُن کا جو بغض و تنفر ہے اس میں کوئی کمی واقع ہو گئی ہو۔

میں یوں ہی قیاس آرائی نہیں کر رہا ہوں کیونکہ میں اس امر کو تسلیم کرتا ہوں کہ بعض بادیہ نشین اور خانہ بدوش قبائل زراعت کی طرف مائل ہو گئے ہیں، لیکن میں یہ عقیدہ نہیں رکھتا ہوں کہ اُن بادیہ نشینوں کا خانہ بدوشی سے زراعت کی جانب اور زراعت سے شہروں میں سکونت کی طرف مائل ہو جانا اُن کی اخلاق کی شائستگی اُن کے آداب کے مرتبہ کی بلندی کا موجب ہو گیا ہو، اس لئے کہ فطری حالت میں قبائل کی معاشی و معاشرتی حالت خواہ کتنی ہی گئی گذری ہو لیکن وہ اخلاق کی نگہبان اور اصولِ ادب کی

---

[1] مؤلف نے یہاں سخت کوتاہ نظری کا ثبوت دیا ہے، یہ ایمان کی حقیقت اور اسلام کے بنیادی عقیدہ کی تحقیق سے ناآشنائی کا نتیجہ ہے، قرآن نے عقیدہ و عمل کی یکسانیت اور ہم آہنگی کو ذریعہ نجات ٹھہرایا ہے، کیونکہ ایمان نام ہے اقرار باللسان، تصدیق بالجنان اور عمل بالارکان کا۔ (مترجم)

حفاظت کا بہت بڑا سبب ہے، تندرستی اور نفوس کی سلامتی تو انسان کو محض اپنے خاندان والوں میں اور شہروں سے دور اور شہریوں کے عوارض و حادثات سے علیحدہ رہنے میں حاصل ہوتی ہے، یہ صحیح ہے کہ صحرائی زندگی بے لطف اور خشک ہے لیکن خیموں میں جو لطف زندگی حاصل ہوتا ہے وہ اونچے اونچے محلوں اور عالیشان مکانوں میں حاصل نہیں ہوتا، یہاں کے باشندوں کو فتنوں اور ہنگاموں کا خطرہ نہیں رہتا، لیکن اگر کوئی عرب شہروں میں سکونت اختیار کرلے اور بالخصوص یورپ کے ملکوں کو اپنا مسکن بنالے تو وہ لہو و لعب کے لوازمات سے قریب ہوگا اور اس کی زندگی کی ضروریات زیادہ ہوں گی، اس کو قہوہ و شیرینی کی خواہش پیدا ہوگی، اس کی بیوی نفیس پوشاک پہننے کی آرزو کرے گی، اب یہ عرب ان حاجات و ضروریاتِ زندگی کی تکمیل نہیں کرسکتا مجبوراً اس قدر تنگدستی کے عالم میں زندگی بسر کرے گا کہ جو روحانی و اخلاقی غم و الم کا باعث ہوجائے گی، اکثر مرتبہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ قبائل جس قدر یورپی شہروں سے قریب تر ہوں ان کے معاشی مصائب میں اضافہ ہوجاتا ہے، اس لحاظ سے سب سے پہلا قبیلہ جو حاکموں کے تحت آگیا اور اقوام غالبہ کے ساتھ اختلاط اور میل جول پیدا کیا وہ اولین قبیلہ ہے جو ہلاکت کے گھاٹ پار اتر گیا، شہریوں کا اخلاقی انحطاط صحرانشینوں کو پست کردیتا ہے، فرانس کے لیے اس جدوجہد کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں ہے کہ وہ اپنی مسلم رعایا کے اندر الجزائر میں مادی اور اخلاقی حیثیات سے انحطاط پیدا کردے، اسی لیے

ہم دیکھتے ہیں کہ فرانس اِس درد کے علاج کے لیے اُتر آیا ہے اور چاہتا ہے کہ اُن کی تہذیب و تربیت کرے، بنابریں اُس نے فرانسیسی تعلیمات کو اُن کے لیے قرار دیا، مدارس تحتانیہ و فوقانیہ اور کلیات فنون و صنائع قائم کیے لیکن اِن تمام کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا ہے، اِس لیے کہ عیسائیوں کی نیت خواہ کتنی ہی خوب اور نیک ہو یہ اِس امر سے خاطر جمع نہیں ہیں کہ باشندگان الجزائر کو متمدن یافتہ بنانے میں اُن کی کوششیں بے ثمر ہو جائیں بالفاظِ دیگر جو کچھ فرانسیسیوں کے ہاتھوں جاری ہو جانے باشندوں کے نزدیک ناپسندیدہ ہے قابلِ نفرت ہے اور مکروہ ہے، بنا بریں فرانسیسی تعلیم اساسی طور پر معیوب ہے اور اب تک اس کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں نکلا، حتیٰ کہ ہماری نسبت اہالی الجزائر کے نفرت آلود جذبات میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی، یہ بیان ہے موسیو شارفریا کا جو جمعیت تعلیم کا ایک رکن ہے، وہ اِسی باب میں کہتا ہے کہ

"اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ باشندگان الجزائر ہمارے متعلق کس قدر تنفر آلود جذبات رکھتے ہیں تو اُن کی فرانسیسی تعلیم کے درجہ پر نظر کرو، جس قدر اُن کی تعلیم زیادہ ہو گی ہمیں اُسی قدر اُن سے احتراز کرنا ہوگا۔

میں ایک مدت تک سوچتا رہا اور اِس حقیقت کا جو موجب یاس اور قطع امید کا سبب ہے مقابلہ کرتا رہا، لیکن میں بجز اُس وقت کے

اپنی رائے سے برگشتہ نہیں ہوا جب کہ میں نے دیکھ لیا کہ جن اشخاص سے میں نے تبادلہ خیال کیا وہ تمام اِسی رائے پر اتفاق رکھتے ہیں۔

الجزائر کا گورنر موسیو ترمان نے مجلس انتظام اعلیٰ میں ۱۸۸۶ء میں کہا:-

"تجربہ اور مشاہدہ ہمیں اِس اَمر کی طرف رہبری کرتا ہے کہ لوگوں میں ہمارے سب سے زیادہ خطرناک دشمن وہ ہیں جن کو ہم زیادہ سے زیادہ تعلیم دے چکے ہیں۔"

علاوہ بریں حکومت نے خود اس کا اعتراف کیا کہ حکومت اہل الجزائر کو فرانسیسی تعلیم کے ذریعہ فرانسیسی قالب میں ڈھالنے سے عاجز ہے، وہ عربی تعلیم کا احیاء نہ کرسکی، حالانکہ بہت سے مدارس قائم کیے، چنانچہ باشندگان الجزائر کے تمام دیسی صنائع اور پیشے حکومت کے قائم کردہ صنعتی و فنی مدارس کے قریب ہونے کی وجہ سے رائگاں ہوگئے۔

اِن بے ثمر تجربات سے جو نتیجہ ہم نکالتے ہیں یہ ہے کہ حکومت کے توسط سے یورپی اور ملکی عناصر کو باہم دیگر قریب تر کر دینا ممکن نہیں ہے اسلیے کہ حکومت کا ہاتھ سنگین ہے اور اِس قسم کے لطیف کام کے اجراء کیلیے اُس کے اندر صلاحیت مفقود ہے، عہدہ داران حکومت کی تندخوئی اور اُن کے مزاج کی تیزی اِس اَمر سے مانع ہے کہ وہ اِس مسئلہ پر بصیرت کے ساتھ عمل کریں، وہ کسی خاطر خواہ نتیجہ کا طویل مدت تک انتظار کرنے کی طاقت

نہیں رکھتے، بہرحال جو وسیلۂ کار دو عناصر کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کے لیے استعمال کیا جائے وہ بہت ناقص اور کمزور رہتے، البتہ یہ ممکن ہے کہ زمانہ بعض متضاد عناصر کو زائل کر دے اور بعض عناصر کے مابین کچھ مشابہت اور ہم رنگی پیدا کر دے لیکن دو عناصر کے درمیان اتحادِ کلی ابداً لآ دتک حاصل نہ ہو سکا، لوگ الجزائر کے مسئلہ میں بہت سے موہوم خیالات رکھتے ہیں، جن میں سے بعض مظنونات کا تذکرہ آج ہمارے لیے مضحکہ خیز ہے، مثلاً موسیو دولانجل نے خیال کیا ہے، جس وقت، اس نے ۱۸۶۱ء میں اپنی قوم کی مجلس شوریٰ کے روبرو تقریر کی اس میں اس جملہ کو ذکر کیا :-

"وہ زمانہ قریب آ رہا ہے کہ جس قوم کے اندر عظمت و شرافت کے جذبات دعوائے بلند درجہ تک پہونچ چکے ہیں وہ قوم اس بات پر فخر کرے گی کہ فرانسیسی قوم کے ساتھ، جو تمام دنیا میں ایک بلند مقام رکھتی ہے، بالکلیہ اشتراک عمل کر رہی ہے۔"

انہی موہوم تصورات میں سے وہ خیال بھی ہے جس کو موسیو لورواتو لیبر نے کہا ہے کہ :-

"عربوں کو ہم اپنی راستہ کا زیر بنایا اور اپنا مخلص دوست بنا سکتے ہیں۔"

تعجب ہے کہ یہ لوگ الجزائر میں اس قسم کے فوائد حاصل کرنے کی امیدیں رکھتے ہیں اور اس کے امیدوار ہیں کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ جس میں اہل الجزائر فرانس کے تقرب میں اس درجہ پر پہونچ جائیں گے کہ فرانسیسی وطنیت کو دل سے دوست رکھیں گے، اگر بفرض محال یہ مدعا حاصل بھی ہو جائے تو یہ ایک ایسا معجزہ ہوگا جس کی نظیر تاریخ میں ملنی دشوار ہے، اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ بلاد اندلس میں یہ دو عناصر ۱۸۳۰ء سے ۱۸۶۰ء یعنی تیس سال تک باہمی میل جول اور دائمی اختلاط رکھتے تھے، اس کے باوجود ہم نے کبھی یہ مشاہدہ نہ کیا کہ حاکم قوم کا وطن محکوم قوموں کا بھی وطن ہو گیا ہو، اس امر واقعہ کے موجود ہونے کے باوجود ہم پر یہ گمان غالب ہو گیا ہے کہ الجزائریوں سے ہم ایسی دوستی اور اخلاص کی امید رکھتے ہیں جس کی توقع ہم کو فرانسیسیوں سے ہے۔

۱۸۸۱ء میں اتفاق سے ابتدائے شورش میں ایک سردار ابو عمامہ نامی نے جو ہمارا سب سے زیادہ دوست تھا، قیام کیا، باغیوں سے جنگ کرنے کے لیے اپنے لوگوں کے ساتھ ملک حوران کی جنوبی سمت روانہ ہوا، جس وقت وہ واپس ہوا تو معلوم ہوا کہ ایک قبیلہ ہمارے دائرہ اطاعت سے خارج ہو گیا ہے، اپنے خیمے اکھیڑ کر اپنی بیوی بچوں اور بھیڑ بکریوں سمیت مراکش کی جانب کوچ کر گیا ہے، یہ سردار اس قبیلے کے تعاقب میں گیا اور ایک سال کے بعد ان کو واپس لے آیا، اور حکومت کو یہ باور کرا دیا کہ وہ بالکلیہ اطاعت و انقیاد کریں گے، اس کے بعد اس سردار کو

عدالت کے انتظامی محکمہ میں اِس جرم کی پاداش میں پیش کر دیا گیا کہ اس نے حکومت فرانس کے ساتھ خیانت کی ہے، درحقیقت اس کی دوستی ہمارے ساتھ خالص نہ تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خیال کئے ہوئے تھے کہ اپنا گھر بار اور جائداد کو ہمارے حوالے کر دیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ بہت سے فرانسیسی اس امر کی طرف مائل نہیں ہیں کہ اپنی رعایا کو اپنی وطن دوستی کی آزمائش میں مبتلا کر دیں اور اُن کی جانفروشی اور وفا شعاری تمام تر اُن کے ملک سے وابستہ ہو جائے

ارباب بحث نے دو عناصر کو ایک دوسرے سے نزدیک کرنے کے بارے میں جن خیالات کا تصور کر لیا ہے ہم اُن تمام کو ذکر کرنا نہیں چاہتے کیونکہ اُن کو بیان کرنے کے لیے لاطائل تشریحات درکار ہوں گے، بعض ارباب بحث کے خیالات اِس درجہ تک پہنچ گئے ہیں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ الجزائر ایسے عربوں سے معمور ہے جو کوٹ اور جاکیٹ پہنے ہوئے ہیں، انھوں نے اپنی مقدس الہامی کتاب کو فراموش کر دیا ہے اور قرآن مجید کو کزیمیرسکی کے ترجمہ کے ذریعہ فرانسیسی زبان میں پڑھتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان اور عیسائی کے درمیان بعد المشرقین ہے، بہت ہی خوشگوار ہے اگر یورپی اور عربی عناصر باہم قریب ہو جائیں، یہ تقرب اور یگانگی خود بخود حاصل ہو جائیگی اس کی منشا یہ ہے کہ فرانسیسی نو آبادکار زراعت اور کاشتکاری کے لیے عربوں کا وسیلہ ڈھونڈھتے ہیں، اگر نو آبادکار عربوں کے ساتھ رفق و مدارات اور انصاف کا برتاؤ کریں تو اُن کے فائدے قوانین و ضوابط کے فائدوں کی بہ نسبت زیادہ ہوں گے، یہی وجہ ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ ایک فرانسیسی جج

پیرس میں سرگرم آزادی پسندوں میں سے ہے کس طرح الجزائر میں کسی وقت آکر دروغ گوئی کے ذریعہ حکومت اشراف کے دور کو زندہ کرنے کی طرف میلان کرے گا، میری نظر میں جو کام مطلوب ہے اس کی تکمیل کے لیے پروٹسٹنٹ مبلغین سزاوار ہیں کیتھولکی مبلغین اس کے لایق نہیں ہو سکتے، اس کا سبب یہ ہے کہ باشندگان الجزائر باوجودے کہ اپنے دین پر قائم ہیں لیکن وہ تمدن کے ارتقائی مراحل اسی وقت طے کر سکتے ہیں جب کہ مبلغین کا ذریعہ تلاش کیا جائے، ہاں اس قسم کی ترقی سست رفتار ہے لیکن ہم اس پر ترقی کا اطلاق کر سکتے ہیں، ہمارے اس دعوی کی دلیل ان قبائل کی حالت ہے جن کے درمیان مبلغین قیام کئے ہوئے ہیں، کیوں کہ یہ ان قبائل والوں کے پاس بہت بڑے درجہ پر فائز ہو گئے ہیں۔

الجزائر میں نصف صدی سے زائد مدت اسلام پر گذر چکی ہے، کہ اس پر فرانس کے تسلط کا کوئی اثر نہ ہوا، نیز تمدن یورپ کی تلاطم خیز موجیں یہاں کے ملکوں کی مذہبی جماعتوں کے جرأت پیا قدموں کے نیچے فنا ہو گئی ہیں، اگر یہ گروہ اپنے اندر اتنی طاقت و قوت کا مشاہدہ کرتے کہ جس کے ذریعہ ہم کو دریا میں ڈالدیں تاکہ ہمارے بعد ایک جامع و محیط اسلامی مملکت (یعنی مذہبی وسیاسی حکومت کے درمیان جامع) برپا کردیں تو وہ لینے کو خطرات میں ڈال دیتے اور سچی حکومت کو منقلب کر دیتے، لیکن وہ اس مقصد و مدعا کو بعید سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی مساعی اور جد و جہد کو اس کام کے لیے صرف کر رہے ہیں کہ اپنے پیرووں کے نفوس میں عداوت و بغض کی روح زیادہ سے

زیادہ پھونک دیں، اِس مقصد کے لیے غالباً بعض ایسے جملوں کا کہہ دینا کافی ہو جاتا ہے جو عیسائیوں کے متعلق غیظ و غضب کے جذبات سے لبریز ہیں، اس کے باوجود مذکورہ جماعتوں کے تمام رؤسا، مغربی تمدن کا مقابلہ کرنے میں ایک نہج اور اسلوب پر نہیں ہیں بلکہ اُن میں سے بعض کا طریقہ ایسے شخص کے طریقہ کے مطابق ہے جو شریعت کو دوسروں کو قید و بند میں کرنے کے لیے چھوڑ کر خود موجودہ تمدن کے ایجادات و اختراعات سے جو مذہب پرستوں پر حرام قرار دیئے گئے ہیں استفادہ کرتا ہے، تمام مذہبی جماعتوں میں بلحاظ اپنے مبداء و مقصد کی پابندی کے زیادہ سخت اور عظیم ترین گروہ سنوسیوں کا ہے، یہ ایسا گروہ ہے کہ اس کا دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ خوف و رعب ہے، اِس گروہ کا ایک رئیس یا امیر ہے، جو ہوشمند اور دانا ہوتا ہے، بعض لوگ اس کو وحدت اسلامیہ کے جامع کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، یہ ایسا شخص ہے کہ جب اُس نے دیکھا کہ الجزائر میں حکومت فرانس کے ساتھ کھلم کھلا مقابلہ کرنے سے عاجز ہے تو الجزائر سے روگرداں ہو کر اسلام کے لیے کوئی اور سرزمین فتح کرنے کی طرف توجہ کی، جس طرح حضرت موسیٰ نے سمجھ لیا کہ خدائے تعالیٰ نے اُن کو فرعون کے آفات و مصائب سے جس میں اُن کی قوم گرفتار تھی، نجات دہندہ بنا کر بھیجا ہے اسی طرح سید سنوسیؒ نے اندازہ لگا لیا کہ مسلمان عیسائیوں کی حکومت سے بہت دلفگار ہیں اور اللہ نے اُن کو غیروں کی غلامی کی زنجیروں کو پاش پاش کرنے کے لیے انتخاب کیا ہے اس لیے انھوں نے ارادہ کر لیا کہ مسلمانوں کو کفار کے

پنجوں سے نجات دیں اور اُن کو دار الحرب کے خطوں سے دار السلام کی سرحدوں میں کھینچ لائیں، چنانچہ اُنھوں نے اُن کو پکار کر کہا کہ تم اپنے گھروں سے نکل پڑو، خدا کی زمین کی فضائیں وسیع ہیں، اس کے بعد سنوسی آبادی سے خالی وسیع و عریض سرزمین میں چلے گئے، جو مسلمان عیسائیوں کے وجود کے ساتھ اپنی بقا کی امید نہ رکھتا تھا اور کفار کی معاشرت سے گریز کرنا چاہتا تھا وہ سنوسی سے جا کر ملحق ہو جاتا تھا، لیکن اس سرزمین میں فلسطین کے خطوں کی طرح شہد و شیر کی نہریں نہیں بہا کرتیں، بلکہ یہ سرزمین وسیع صحرائے لیبیا ہے جس کو سنوسی نے اس لیے پسند کر لیا تاکہ عرب بلاد الجزائر، تیونس، طرابلس، مصر اور باسفورس سے ہجرت کر کے یہاں چلے آئیں، باوجودیکہ یہ تمام ممالک سرسبز باغات اور شاداب و نظر افروز مناظر سے لبریز ہیں، لیکن سنوسی کی یہ پکار ہر روز بلاد اسلامیہ میں تجاوب ہو رہی ہے، جس طرح گذشتہ زمانے میں بنی اسرائیل نے ملک مصر کو ترک کر دیا تھا اسی طرح اس ریگستانی علاقے کے درمیان وارد ہونے والے بلا غم و غصہ اور بغیر تکان کے مقیم ہو جاتے ہیں، ان نو واردوں میں سے کسی کو کوئی حسرت و ملال نہیں ہوتا جیسا کہ وہ شخص انتہائی افسوس کرتا ہے جو کافروں کی حکومت میں گرفتار ہے، نو واردوں کی شبانہ روز محنتوں اور کارگزاریوں نے صحرا کو مرغزاروں اور نخلستانوں میں تبدیل کر دیا ہے، آج کل یہاں جابجا پانی کے چشمے، کنویں اور نخلستان پائے جاتے ہیں، ان مہاجرین کی مثال قبائلی عبادیان کی طرح ہے جنھوں نے

صحرائے ماذاب کی طرف ہجرت کی اور وہیں آباد ہو گئے؛

جو مسلمان ہماری حکومت پر رضامند نہیں ہیں اُن کا جنوب سے
ادرگرد اجتماع ایک ایسا خطرہ ہے جس کی طرف ہمارے اندلس کے حاکموں
نے اشارہ کیا ہے، دول یورپ کو اس اجتماع سے پرحذر رہنا چاہیے
الجزائر مسلمانوں کے درمیان ایسے اشخاص کو دیکھتا ہے جو اس کے
دشمن ہیں، جب تک الجزائر کا تعلق دو دشمنوں کے درمیان برقرار ہے
یہ اس امر کو ترجیح دیتا ہے کہ یہ گروہ اس سے دور ہو جائے اس لیے
کہ یہ جب الجزائر سے دور ہو جائے گا تو الجزائر ایک عصبیت پرور جمعیت
سے آسودہ اور مطمئن ہو جائے گا، اس کے باوجود اگر فرانس کو اتفاقاً
ضرورت پڑ جائے کہ یورپی جنگوں کی وجہ سے اپنی افریقائی فوجوں سے
کمک چاہے اور کوئی حکومت مقابلہ پر اتر آئے اور فرانس کو افریقہ میں
کمزور کر دے اور گروہ سنوسی اور دیگر جماعتوں کو عیسائی حکومتوں کے
خلاف آمادہ کر دے تو اس صورت میں اس کا اندیشہ ہے کہ الجزائر
میں کوئی ایسا انقلاب رونما ہو جائے جس کا انجام دردناک ہو، لیکن
عین اسی حالت میں کہ حکومت فرانس کی یہ زبون حالی ہے جس کا ہم
اس سے زیادہ تصور نہیں کر سکتے ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ روساء کا باہمی
اختلاف اور طبقاتی نزاع و کش مکش اس امر میں مانع ہے کہ انقلاب کی
یہ آگ تمام اطراف بلاد میں پھیل جائے، اس لحاظ سے اندرونی مرض
یہ ہے کہ رئیس اور حکومت کا مسلمان نہیں ہیں، یہی بے ترتیبی اور طوفان

بدتمیزی غالباً تمام اولاد سام کی کمزوری و انحطاط کے اسباب ہیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت اسماعیلؑ ہمیشہ اپنے خیمے اپنے بھائیوں کے خیموں کے مقابلہ میں نصب کیا کرتے تھے، اگر وہ داخلی اختلافات و اضطرابات نہ ہوتے جو گذشتہ ادوار میں مسلمانوں کے مابین واقع ہوئے تو عیسائیت کو کسی صورت کہیں بھی نجات نہ ملتی، یہی وہ اسباب ہیں جو اتحاد عالم اسلامی کو قائم کرنے کے عزم کو ضعیف کر دیتے ہیں، اگر یہ اسباب نہ ہوتے تو فرانس شمالی افریقہ میں جن غلطیوں کا مرتکب ہوا ہے اُن کے پیش نظر اپنے مقبوضات کو محفوظ نہ کرسکتا، یہ مقبوضات اپنے طبعی نشوونما کے اقتضاء پر دو کروڑ مسلمانوں پر مشتمل ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ اجتماعی انقلاب کے لحاظ سے الجزائر میں کوئی خطرہ نہیں ہے، لیکن یہ شہر ہمیشہ جزئی اضطرابات کا شکار رہیں، یہ اضطرابات مذہبی موثرات و عوامل کے علاوہ دیگر ذرائع و جہات سے پیدا ہوتے ہیں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ باشندگان الجزائر خود بخود اپنے اُن رؤسا و مشائخ کے نصائح کے علی الرغم جو اُن کو کیا کرتے ہیں سرکشی و بغاوت کر بیٹھتے ہیں، کیونکہ رؤسا و مشائخ بخوبی آگاہ ہیں کہ ہم اُن کی سرکوبی کی قدرت رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرتے جس کا انجام اُن کے لیے اور اُن کے پیروؤں کے لیے وبال ثابت ہو بغاوت کے بیشتر اسباب یہاں کے جنوبی حصے میں سرزد ہوتے ہیں جہاں کے رؤسا چاہتے ہیں کہ اپنے حقوق از سرِ نو حاصل کرلیں کیوں کہ یہ اُن اقوام سے تعلق رکھتے ہیں جو قدیم زمانے میں ان ملکوں میں حکومت و

دیا دت کے مالک تھے، دوسری طرف باشندوں کی تنگدستی ہے اور بعض
قوانین و تعزیرات کے مقتضیات کو نافذ کرنے میں عہدہ دارانِ حکومت کی
غلط روش ہے، اِن تمام کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ جو بھی بغاوت و شورش
شروع ہوتی ہے شورش پسند اور باغی اصحاب اِس تحریک کو ایک مذہبی
رنگ قرار دیتے ہیں اور مقدس جنگ کا اعلان کر دیتے ہیں، چنانچہ وہ کسی
ایک مذہبی رئیس کو جو صاحبِ اقتدار ہو اپنی تحریک کا قائد عمومی بنا لیتے ہیں
خواہ یہ رئیس اِس کام کے لیے کتنا ہی ابا و انکار نہ کرتا ہو، اُس کی ایک
نہیں سنتے، ابتدا حسب معمول اِن تحریکات کی کم اہمیت ہے، لیکن ایسے
اشخاص کی غلطیوں کی بنا پر جو اِس بغاوت کو فرد کرنے پر مامور کیے جاتے
ہیں، یہ فتنہ اور مشتعل ہو جاتا ہے، اگر حکومت باشندوں کے انتظام میں
عادلانہ اور حکیمانہ مقتضا پر سلوک کرے اور قدیم حقوق کو مکمل طور پر رؤسا و
قبائل کو عطا کر دے، جنوبی حصوں میں ریلوے لائنیں استوار کر دے
اور عسکری نظام کی اصلاح کر دے تو یہ انقلابی تحریکات بلاد الجزائر میں کم
ہو جاتی ہیں اور مسلمان بحر روم کے ساحلوں سے لے کر نائیجیریا کے سواحل
تک ساکن ہو جاتے ہیں۔

گزشتہ بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ دول یورپ پر، جو اپنی نوآبادیوں کے دائرہ کو وسیع کرنے کے خواہشمند ہیں، یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی مسلمان رعایا کو جیسا کہ اس کا حق ہے، سمجھیں، اس لیے کہ یورپ کی حکومتیں وہی اعتقاد اب تک رکھتی ہیں جو قرون وسطیٰ میں رکھتی تھیں، وہ اعتقاد یہ ہے کہ اسلام بت پرستانہ مذہب کی ایک شکل ہے، لیکن معدودے چند مستشرقین اس عقیدہ سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ ان کے آراء و نظریات سیاست پر کچھ اثر انداز نہیں ہیں، اگر یہ جائز ہو کہ عقلی حیثیت سے ان مذاہب و ادیان کی ترتیب کے قائل ہوں جن کو بنی نوع انسان تسلیم کرتے ہیں تو مذہب عیسائیت کے بعد اسلام کو تمام ادیان کی پہلی صف میں شمار کرنا چاہیئے اس لیے کہ مسیحیت بلا شبہ معقولات کے لحاظ سے اسلام سے بالاتر ہے[1]۔ یہ کسی طرح روا نہیں کہ عیسائی اسلام کو بت پرستی سے نسبت دیں، حالانکہ اسلام اور

---

[1] یہ تصور حقیقت سے کوسوں دور اور دلائل و شواہد کے بالکل منافی ہے۔"

نصرانیت کئی حیثیتوں سے باہم متفق ہیں حتی کہ یوحنا اسیرن نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اسلام مسیحیت کی ایک نئی شکل ہے بے شک مسلمان ابن مریم کی الوہیت کے قائل نہیں ہیں، لیکن حضرت عیسیٰ کی دیگر تمام جلیل القدر پیغمبروں کی طرح تعظیم و تکریم کرتے ہیں:

اذ قال اللہ یا عیسیٰ انی متوفیک ورافعک الی ومطھرک من الذین کفروا وجاعل الذین اتبعوک فوق الذین کفروا الی یوم القیامۃ (آل عمران)

جس وقت خدا نے فرمایا کہ اے عیسیٰ میں تمہاری مدت پوری کرنے والا ہوں اور تم کو اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور تم کو کافروں سے پاک کرنے والا ہوں اور جن لوگوں نے تمہاری پیروی کی ہے ان کو انکار کرنے والوں پر قیامت تک فوقیت دینے والا ہوں۔

اور اس امر کے معترف ہیں کہ حضرت عیسیٰ کی ولادت معجزات میں سے ہے:

واذکر فی الکتاب مریم اذ انتبذت من اھلھا مکانا شرقیا فاتخذت من دونھم حجابا فارسلنا الیھا روحنا فتمثل لھا بشرا سویا قالت انی اعوذ بالرحمٰن

اور اس کتاب میں مریم کا قصہ بیان کرو جب کہ وہ اپنے کنبہ والوں سے الگ ہو کر جانب شرق ایک مکان میں جا گئیں، اور ان سے ایک آڑ کر لی پس ہم نے ان کی طرف اپنی روح (جبرئیل) کو بھیجا، اور وہ مریم کے لیے ٹھیک ٹھاک

منك ان كنت تقيا قال انما
انا رسول ربك لاهب لك
غلاما ذكيا قالت انى يكون
لى غلام ولم يمسسنى بشر
ولم اك بغيا قال كذالك
قال ربك هو على هين
ولنجعله آية للناس ورحمة
منا وكان امرا مقضيا فحملته
فانتبذت به مكانا قصيا
فاجاءها المخاض الى
جذع النخلة قالت يا
ليتنى مت قبل هذا وكنت
نسيا منسيا فناداها من
تحتها الا تحزنى قد
جعل ربك تحتك سريا
وهزى اليك بجذع
النخلة تساقط عليك
رطبا جنيا فكلى واشربى
وقرى عينا فاما ترين من

آدمی کی صورت بن گئے، مریم نے
کہا کہ اگر تو نیک ہے تو میں تجھ سے
ضرور خدا کی پناہ مانگتی ہوں کہ تو مجھ
سے کوئی غرض نہ رکھے، روح الامین
نے عرض کی کہ میں تو تمہارے پروردگار
کا فرستادہ ہوں کہ تمہیں ایک پاکیزہ
لڑکا دے دوں، مریم نے فرمایا میرے
لڑکا کہاں سے ہوگا؟ حالانکہ مجھے کسی
مرد نے نہیں چھوا اور نہ میں بدکار ہوں
روح الامین نے کہا یونہی ہوگا تمہارے
پروردگار نے فرمایا ہے کہ وہ امر (بن
باپ کے بیٹا پیدا کر دینا) میرے لیے
آسان ہے اور اس سے غرض یہ ہے
کہ ہم اسی کو کل آدمیوں کے لیے ایک
نشانی اور اپنی طرف سے رحمت قرار
دیں اور یہ معاملہ طے ہو چکا ہے پس
وہ حضرت مریمؑ روح اللہ سے حاملہ
ہو گئیں اور اپنے اس حمل کو لیے
ہوئے ایک دور کے مکان میں چلی گئیں

البشر احدا فقولی انی
نذرت للرحمٰن صوما
فلن اکلم الیوم انسیا
فاتت به قومها تحمله
قالوا یا مریم لقد جئت
شیئاً فریا یا اخت
هٰرون ما کان ابوك امرؤ
سوء وما کانت امك بغیا
فاشارت الیه قالوا کیف
نکلم من کان فی المهد
صبیا قال انی عبد الله آتانی
الکتاب وجعلنی نبیا وجعلنی
مبارکا اینما کنت واوصانی
بالصلوٰة والزکوٰة مادمت حیاً
وبراً بوالدتی ولم یجعلنی
جبارا شقیا والسلام علی
یوم ولدت ویوم اموت
ویوم ابعث حیا ذلك
عیسی بن مریم قول الحق

پھر دردِ زہ ان کو ایک کھجور کے درخت
کی جڑ میں لے آیا وہ کہنے لگیں کاش میں
اس سے پہلے مر جاتی اور بھولی بسری
ہو جاتی، پس اس کے نیچے سے اس
(بچے) نے آواز دی کہ رنجیدہ مت ہو
کہ تمہارے پروردگار نے تمہارے پاؤں
کے نیچے تو ایک چشمہ جاری کر دیا ہے
اور اس کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلاؤ
کہ تازہ تازہ خرمے تم پر ٹپک
پڑیں گے، پس خرمے کھاؤ اور چشمہ
کا پانی پیو، اور آنکھیں ٹھنڈی کرو،
پھر اگر کوئی آدمی نظر پڑ جائے تو
اس سے اشارہ سے کہدینا کہ
میں نے خدا کے لیے خاموش رہنے کا
روزہ رکھا ہے، لہذا میں آج کسی
انسان سے ہرگز بات نہ کروں گی
پس حضرت مریم اس بچے کو لیے
ہوئے اپنے لوگوں کے پاس آئیں
وہ بولے کہ اے مریم یہ تو تم ناموزوں سا

چیز لائیں اے مقدس عورت نہ تیرا باپ
کوئی برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں
بدکار تھی، پس مریمؑ نے اس بچے کی
طرف اشارہ کر دیا وہ بولے کہ ہم
اس سے کیونکر بات کریں جو گہوارہ
میں بچہ ہے، وہ (بچہ بہ قدرت خدا)
گویا ہوا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے
مجھے کتاب عطا فرمائی ہے اور مجھے نبی
بنایا ہے اور جہاں کہیں میں ہوں
مجھے برکت والا مقرر کیا ہے اور جب
تک میں زندہ رہوں مجھے نماز ادا کرنے کا
اور زکوٰۃ دینے کا حکم دیا ہے اور مجھے
میری والدہ کا مطیع بنایا ہے اور مجھے
سخت گیر اور بدبخت نہیں بنایا ہے اور
خاص سلامتی مجھ پر اس دن بھی ہے جس
دن پیدا کیا گیا اور اس دن بھی ہوگی جس
دن مروں گا اور اس دن بھی جس دن
زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا، یہی ہیں عیسیٰ
ابن مریم سچی بات (اتنی ہی ہے) جس کے

الذی فیه یمترون ما کان الله ان یتخذ من ولد سبحانه اذا قضی امرا فانما یقول له کن فیکون ۔
(مریم)

بارے میں یہ لوگ جھگڑتے ہیں خدا کے لیے زیبا نہیں ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے اُس کی ذات منزہ ہے (اس کی شان یہ ہے کہ) جب کسی معاملہ کو طے کر چکے تو سوائے اس کے نہیں ہے کہ وہ اُس کی نسبت فرمائے کہ ہو اور وہ ہو جائے ۔

[illegible]

نیز مسلمان یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ جبریل ایک فرشتہ ہے جو یہ بشارت لے آیا، اُسی فرشتہ کے ذریعہ خدا نے قرآن کو وحی کے وسیلہ سے آنحضرتؐ پر نازل کیا، مسلمان یہودیوں سے نفرت رکھتے ہیں کیونکہ اُنھوں نے حضرت مسیحؑ کی موت پر یقین نہیں رکھتے جیسا کہ اس اعتقاد پر قرآن کی یہ آیت دلالت کرتی ہے ۔

وقولهم انا قتلنا المسیح عیسی بن مریم رسول الله وما قتلوه وما صلبوه ولکن شبه لهم وان الذین اختلفوا فیه لفی شك منه ما لهم به من علم الا اتباع الظن وما قتلوه

اور اس قول کے سبب کہ ہم نے مسیح ابن مریم خدا کے رسول کو قتل کر دیا ۔ (اُن کے دلوں پر چھاپہ لگا دیا) حالانکہ اُنھوں نے نہ اُن کو قتل کیا اور نہ صلیب دی، بلکہ اُن (یہودیوں) کے لیے ایک شخص اُن کی شبیہ بنا دیا گیا تھا اور جن لوگوں نے مسیح کے بارہ میں اس قت

یقیناً بل رفعه الله الیه وکان الله عزیزاً حکیما۔ (النساء)

اختلاف کیا تھا وہ آج تک ان کے بارے میں شک ہی میں پڑے ہوئے گمان کی پیروی کے اس بارہ میں ان کو کوئی علم نہیں ہے حالانکہ مسیح کو انھوں نے بالیقین قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو اپنے پاس اٹھا لیا اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

امیر عبدالقادر الجزائری نے اسلام اور مسیحیت کے مابین مشابہت کی طرف توجہ کی اور خیال کیا کہ ان دونوں مذاہب کے مابین ہم آہنگی و موافقت ممکن ہے، عبدالقادر ذی ہوش اور بلند فہم انسان تھا، کہتا تھا اگر مسلمان اور عیسائی میری باتوں پر کان دھریں تو میں ان کے درمیان سے نفرت انگیز اسباب کو زائل کردوں گا، اس طرح وہ ظاہر و باطن میں باہم بھائی بھائی ہو جائیں گے وہ تین پیغمبروں کو جو وحدۃ الوجود کے قائل ہیں ایسے تین بھائیوں سے تشبیہ دیتا تھا جو تین ماؤں کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں (ملاحظہ ہو عبدالقادر کی کتاب نداء الغافلین) لیکن ہم بذاتِ خود اس امر کے اندرونی جذبات و احساسات جو کچھ تھے ان سے یہ توقع نہیں رکھتے اس لیے کہ ایک خاندان کے افراد کے اندر جو کینہ پرور جذبات پیدا ہو جاتے ہیں ان کو کسی طرح زائل نہیں کیا جا سکتا، اس سطحی مشابہت کے ذریعہ اس بڑے شگاف کو جو مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین کھل گیا ہے

بند نہیں کیا جا سکتا، یہ ممکن ہے کہ عیسائی اسلام کے متعلق اپنے تجاہل عارفانہ سے دست بردار ہو جائیں اور اعتراف کرلیں کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو اُن کے مذہب سے قریبی تعلق رکھتا ہے لیکن مسلمان اس امر کو ہرگز قبول نہیں کر سکتے کہ تثلیث کا مفہوم تعدد آلہ کے سوا اور کچھ ہو سکتا ہے، نیز وہ اس بات کا اعتقاد بھی نہ رکھیں گے کہ لغزش آدمؑ بنی نوع انسان کے تمام گناہوں کا موجب اور اولاد آدم کی ساری لغزشوں کا سبب ہے، اس کے بھی قائل نہ ہوں گے کہ حضرت مسیح صورت انسانی میں مجسم ہوئے اور نہ اس کے معترف کہ انھوں نے اپنے کو نوع بشر پر قربان کر دیا، تمام علماء توحید کہتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا قرار دینے کی صورت میں اگر باپ اور بیٹے کو ایک خدا تصور کر لیا جائے تو اس کا کچھ فائدہ نہ ہوگا اور اگر ان میں سے ہر ایک مستقل خدا ہو تو تناقض، علاوہ بریں مسیحی علماء لاھوت کے نقطہائے نظر بھی اس مسئلہ میں مختلف ہیں کہ خطائے آدم نہ ہونے کی صورت میں تجسیم مسیحؑ حاصل ہوگا یا نہیں؟

ہمیں اپنی امیدوں اور آرزوں کو اس امر کی طرف مبذول کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہماری مسلمان رعایا الجزائر میں فرانسیسی ہو جائے بلکہ ہمیں یہ کوشش اور جد و جہد کرنی چاہیئے کہ ہم ان کے ساتھ صلح جویانہ اور امن پسندانہ طریقہ سے زندگی بسر کریں، یہی ہے اس مشکل کا ایک سہل اور سادہ حل، ہمیں نہیں معلوم کہ کس لیے اہل بحث اور محققین اس حل کو ذکر نہیں کرتے اور اس سے کم درجہ کا حل پیش کرنے کی

کوشش کرتے ہیں، میں اس مدعا کا سبب نہیں سمجھتا کہ انھیں یہ حکم دینے کی کیا ضرورت درپیش ہوئی کہ الجزائر کے مسلمانوں کو سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں کہ یا تو وہ فرانسیسی ہوجائیں یا ہلاکت کے گھاٹ اتر جائیں، فی الواقع فرانسیسی اس امر سے خوشحال ہوجائیں گے کہ مسلمان فرانسیسی ہوجائیں، اس لیے کہ فرانسیسیوں کا میلانِ طبع یہ ہے کہ وہ ہر چیز میں الجزائریوں کے ساتھ یکرنگ ہوجائیں، اس لحاظ سے حکومت فرانس کا ہر عہدہ دار یہ خیال کرتا ہے کہ شہر الجزائر باوجود ان اختلافات کے جو بلحاظ زمین، امکنہ و باشندگان ان کے درمیان موجود ہیں، پیرس کے شہر کی طرح ہوجائے، بنا بریں وہ ترقی کو اس طور سے مشاہدہ کرنے کے عادی بن چکے ہیں کہ چند دیہات اور قصبات ایک دوسرے سے قریب اور باہمی مخلوط ہو کر شہروں میں بلا کسی تفاوت کے فرانس کے شہروں کی طرح تبدیل ہوجائیں، یہ تمام خشک خیالات اور غیر نتیجہ خیز تصورات ہیں جو اس امر سے مانع ہیں کہ لوگ الجزائر کے حقیقی حاجات و لوازم سے مطلع ہوجائیں، باقی رہا یہ امر کہ باشندگانِ الجزائر کو فرانسیسی قومیت و نسلیت کے سانچے میں ڈھال دیا جائے تو اس سے کوئی فائدہ نہیں، یہ ہو سکتا ہے کہ بعض حکومتی اداروں میں اس کا کچھ فائدہ برآمد ہو جو فی الجملہ صورت حال میں کچھ تغیر و تبدل پیدا کردے اور سرکاری مردم شماری کی رو سے اعداد کو واضح کردیں لیکن یہ تمام امور الجزائریوں کو فرانسیسی وطنیت کے قالب میں نہیں ڈھال سکتے، اس کے علاوہ معاہدۂ الجزائر میں اس کا

حق نہیں دے سکتا کہ ہم باشندگانِ الجزائر کو اپنی نسلیت وجنسیت میں تنگ جانے کے لئے۔۔۔ آمادہ کریں، ہم ہمیشہ سے اُن کے سامنے یہ حقیقت واضح کرتے ہیں کہ قومیت وجنسیت ایک ایسا حق ہے جو ایک قوم کے ساتھ مخصوص وممتاز ہے اور جس سے دوسری قومیں محروم ہیں، گویا ہم یونہی گمان کرتے ہیں کہ مسلمان بعض حقوق وامتیازات کو اپنے مذہبی مقتضیات پر عمل پیرا ہونے سے مانع سمجھتے ہیں، اس کے باوجود موسیو نسل کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر جزائریوں کو فرانسیسی قومیت کے شیشے میں اتار دیا جائے تو مسئلہ حل ہو جاتا ہے، مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ وہ لوگ ہم سے اختلاط پیدا کرتے رہیں گے، اور اکثریت اپنے اندر تغیر پیدا کر کے فرانسیسی قالب اختیار کر لے گی، جب اکثر لوگ یہ دیکھیں گے کہ باشندگانِ الجزائر کی ضروریات تبدیل اُن کے بلاد متغیر ہو گئے ہیں تو لامحالہ وہ جنوب کی طرف ہجرت کر جائیں گے اور اُن کے بجائے کوئی دوسری قوم آئے گی جس کی شان بالاتر اور جس کا مقام اعلیٰ تر ہوگا؛

میرا اعتقاد یہ ہے کہ قبائل کی جنوبی صحرا کی طرف ہجرت ایک خیال باطل ہے، اس کی مثال ایسی ہے کہ یہ اعتراف کر لیا جائے کہ ممکن ہے کہ جب اہل الجزائر سختیاں جھیلیں گے تو رفتہ رفتہ شہروں کو چھوڑ دیں گے، باقی رہا یہ کہ جس قدر تمدن یورپ بلاد الجزائر میں داخل ہوگا، باشندے بتدریج ختم اور زوال پذیر ہو جائیں گے میں اس رعاء کو بجز ایک گوشہ کے تسلیم نہیں کرتا کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ متمدن اشخاص کے ساتھ باشندوں کا تصادم اہالی ملک کے وسائل زندگی کو کم کر دے لیکن اُن کے وجود میں

اثر انداز نہ ہوگا، بلکہ باشندے تو اہل یورپ سے تو الادتناسل کا سلسلہ بہت زیادہ جاری رکھیں گے، اس کے علاوہ اس مسئلہ کا بھی اضافہ کیجئے کہ اہل یورپ جن مسکرات کو اپنی بعض اجنبی قوموں کے وجود کو کالعدم اور محو کر دینے کے لیے وسیلہ قرار دیتے ہیں وہ بھی باشندگانِ الجزائر پر کچھ اثر نہیں کرتے، اس لیے کہ باشندے مسکرات کو حد درجہ دشمن سمجھتے ہیں، اس صورت میں ہمارا فرض ہے کہ ہم الجزائر میں قدیم باشندوں اور دیرینہ فاتحین کے پہلو بہ پہلو زندگی بسر کریں اور ان کی قومیت و نسلیت کو تبدیل کرنے یا ان کے شعائر و امتیازات کو متغیر کر دینے کا خیال چھوڑ دیں، کیونکہ یہ دونوں خیالات محض ظاہر فریب تصور سے بڑھ کر کوئی حقیقت نہیں رکھتے، اس بارے میں بھی کوئی خوف اور اندیشہ نہیں ہے بلکہ بیم و ہراسانی ہمارے لیے اس صورت میں درپیش ہوتی ہے کہ ہم ان کو یہ لازمی قرار دے دیں کہ وہ ہماری قومیت کے قالب میں ڈھل جائیں، اور ان کو بھی وہی سیاسی حقوق و تحفظات عطا کریں جن کے ہم حامل ہیں۔

اگر ہمارے حکام بالا دست باشندگان الجزائر کو، جن کے حال سے وہ ناواقف ہیں یا واقعہ کے خلاف ان کا تصور رکھتے ہیں حقیقی طور پر باخبر ہو جائیں اور باشندوں کی بعض باتوں کو، جن کی وہ تمنا رکھتے ہیں انہی کے مطالبات کے موافق تسلیم کریں اور ان کے محاصل میں کمی کر دیں تو خطرہ دور ہو جائے گا اور ان سے بے وجہ ہراسانی و پریشانی کی نوبت ہی نہ آئے گی، یہ لوگ نوآبادی کے لئے سب سے بڑے ممد و معاون

بن جائیں گے، ہوسکتا ہے کہ کوئی معترض ہم سے یہ کہے کہ یہ مبہم سیاست
ہے ہم جواب دیں گے یہی رویہ درست اور یہی مقصود بالذات ہے،
اس لیے کہ جو سیاست قواعد ثابتہ پر مبنی اور جس افسوں سے ہم پہلے ہی
سے تجربہ و واقفیت رکھتے ہیں وہ الجزائر کے حق میں اس سیاست
سے زیادہ مضر ہوگئی ہے جو احوال و ظروف کے مطابق تجربات سے
حاصل ہوئی ہے، یہی ہے وہ سیاست جو مطلوب ہے جس کو مذکورۂ بالا
مدعا کے علاوہ ایک اور مبدا و مرجع اساس کی حیثیت رکھتا ہے تعبیر کرنا
چاہیئے وہ مبدا و اساس یہ ہے سیاست براہ راست یہودیوں کی مخالفت
پر ہونی چاہیئے، یہ سیاست ان ملکوں میں امن و سلامتی کی موجب ہے
یہی وجہ ہے کہ موسیو کریمو نے جو یہ کام کیا کہ تمام یہودیوں کو الجزائر میں
فرانسیسی رعایا قرار دے دیا وہ ہمیشہ ایک بدشگون بن کر رہا، یہ بدشگونی
اس لحاظ سے نہیں ہے کہ عرب اس امر سے ناک بھوں چڑھاتے
ہیں کہ یہودیوں کو ایسے حقوق و تحفظات مل گئے جس کے وہ پہلے حامل
نہ تھے، جیسا کہ بعضوں نے اس قسم کا گمان کر لیا ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے
کہ یہ طرز عمل قومی خود سری کا موجب ہو جاتا ہے جو عربوں کے اعتقاد کے
بموجب ان کے زیر اقتدار رہنا چاہیئے، اس کے برخلاف ایک اور
چیز ہے جو عربوں کے ذہن میں پیوست ہوئی ہے کہ عرب یہودیوں کو نہایت
ہی نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے اور ان کو حقیر شمار کرتے ہیں، یہی وجہ
ہے کہ یہود اس ذلت کی تلافی کر لیتے ہیں جو ان کو گذشتہ پہونچ چکی ہے،

باقی رہا یہ سوال کہ عربوں کو اس قسم کے حقوق دے دیئے جائیں تاکہ وہ فرانسیسی قومیت اختیار کر لیں تو یہ ایسا پہلو ہوگا جس کی وجہ سے وہ اپنے دین کو چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں گے، جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، لیکن وہ ہمارے دشمن ہو جائیں گے، اس وجہ سے کہ ہم نے یہ حقوق ایسے اشخاص کو دے دیئے ہیں جن کو عرب اپنے سے پست تر شمار کرنے کے عادی ہو چکے تھے آج کل یہودیوں کی سربلندی الجزائر میں اس درجہ تک پہنچ گئی ہے کہ دونوں فریقوں میں جنگ ہونا باقی ہے اس لحاظ سے عیسائی جس چیز کے متحمل ہیں مسلمان اس کو برداشت نہیں کر سکتے، وہ وقت قریب آ پہونچا ہے کہ تمام عرب اٹھ کھڑے ہوں اور بنی اسرائیل کو ان کی سابقہ ذلت و مسکنت اور پستی و حقارت کی طرف ڈھکیل دیں، اس صورت میں یہودیوں کو اپنی ملت کی طرف رجوع کرنے کا وقت بھی ہاتھوں سے نکل جائے گا، ممکن ہے کہ عیسائی الجزائر کے فتنہ سے بے خوف اور امین نہ ہوں؛

افریقائے وسطی میں ہماری اپنی سیاست کے پیش نظر اپنے مباحث سے ایک اور امر کا خلاصہ ہم پیش کرتے ہیں کہ اس امر تک رسائی سہل ہے وہ امر یہ ہے کہ ہم یہ نہیں کہتے ہیں کہ فرانس مسلمانوں کے ساتھ حلف و پیمان باندھ لے گا اگرچہ یہی سیاسی مصلحت ہے کہ جس کا عقیدہ فرانسیسی پہلے ہی سے رکھے ہوئے ہیں، لیکن ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ جس طرح بھی ممکن ہو ہمیں اسلام کے ساتھ حسن رفتار اور نرمش اسلوبی کے ساتھ سلوک کرنا چاہیے ہم دیکھ رہے ہیں کہ قبائل فولبوس و خواصہ اپنے نفوذ و اقتدار کو تمام مقبوضات

میں جو کونخوں میں ہماری جاگیروں تک پھیلے ہوئے ہیں بڑھا چکے ہیں، اور مسلسل
خطِ استوا تک اپنے قدموں کے اَمِٹ نشان چھوڑ چکے ہیں، جہاں کہیں
وہ گئے ہیں اسلام کا پیغام پہونچا چکے ہیں اور اس کو وہاں داخل کر چکے ہیں
محال نہیں تو کم از کم مشکل ضرور ہے کہ ہم اس عظیم الشان تحریک کو آگے بڑھنے
سے روک دیں، لہٰذا ہمیں بقدرِ امکان یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ اس نقل و
حرکت سے بہرہ اندوز ہوں اور ہمیں اُمم اسلامی اور بت پرست قوموں کے
کام میں دخل اندازی سے اور اُن کو ختم کرنے یا جنم بخشنے کے تصور سے احتراز
کرنا چاہیئے۔ ہمارا یہ فریضہ ہے کہ ہم اِن ہنگاموں اور سرگرمیوں کے، جو
اِن جماعتوں میں برپا ہیں، نگرانی کریں اور فولبوسین کو اُن کے قدیم فطری
اُصول پر ہی چھوڑ دیں تاکہ وہ وحشیوں سے کچھ ممالک حاصل کرلیں اور ہم
مسلمان بادشاہوں کے رویّے کے مطابق چلیں اور اِس پست قوم کے
مقابلے میں اپنی حمایت کو مسلمانوں کی حمایت کا ضمیمہ ٹھہرالیں، بالخصوص استعماری
سیاست کی غلط کاری کے وقوع پذیر ہونے سے یعنی اکتسابات و عملیات کیلئے
دائرہ نفوذ کی تحصیل سے اجتناب لازمی ہے، اگر کوئی قوم ہم پر یہ اعتراض
کرے کہ یہ ترتیب مسیحی فرانس کے شایانِ شان نہیں ہے اور مسیحی فرانس کو
چاہیئے کہ اپنی امکانی قوت سے دین اسلام کی نشر و اشاعت کی اپنے افریقائی
مقبوضات میں روک تھام کرے، تو میں اس سوال کے جواب کے لیے
کاردینال مصرحوبڑ کی آڑ لیتا ہوں، اس کا عقیدہ یہ ہے کہ تاریخ کلیسا بت پرست
قوموں کو اُمم اسلامی میں جذب و فنا ہو جانے کو جملہ مقاصد الٰہی میں سے حتمی مانتی ہے

کارڈینال کہتا ہے:۔

"یہ اسلام کا حق ہے کہ وحشی قوموں کو جن میں جہل و نادانی کے عناصر جڑ پکڑ چکے ہیں، اور خصوصاً افریقائی اقوام کو تمدن کے لیے مہیا کرے اس لیے کہ ان قوموں کو اپنی فطری کم ادراکی اور خواہشات نفسانی کی عادی ہونے کی وجہ سے بت پرستی سے اسلام میں منتقل ہو جانا چاہیے تاکہ اُن کو اسلام سے عیسائیت کی طرف منتقل کر دینا ممکن ہو جائے لیکن ہمارے لیے یہ کہاں ممکن ہے کہ ہم اُن قوموں کے رُخ کو قرآن سے انجیل کی طرف موڑ دیں، یہ کس طرح ممکن ہے کہ بت پرست قومیں مسلمان ہونے کے بعد بندۂ مسیح ہو جائیں اور اسلام تو ایسا دین ہے کہ اُن کے دلوں میں گھر کر جاتا ہے اور کسی طرح جُدا نہیں ہوتا، یہیں سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ مقصد الٰہی ہم پر مشتبہ ہے اور اس مشیتِ ایزدی کو سمجھنے سے ہماری عقل قاصر و درماندہ ہے، علاوہ بریں اگر اسلام سے سوائے اس کے اور کوئی فائدہ متصور نہ ہو کہ بندگانِ اصنام کو بت پرستی سے نکال کر توحید میں منتقل کر دے اور اُن کے اخلاق و ملکات کو ترقی دے تو یہی اس کے لیے کافی ہے اور یہ ہمیں اس بات کے لیے آمادہ کر رہا ہے کہ ہم مسلمانوں کے ساتھ دو ضرروں میں سے سب سے ہلکے ضرر کے اصول پر عمل کرتے ہوئے سیاست میں مدارات و عدالت کو ملحوظ رکھیں اور اُن سے حسن معاملہ اور نیک برتاؤ کریں۔"

تمت

عالمگیر اسلامی تصورات

دنیا کی موجودہ بے چینی کا علاج اور سسکتی ہوئی انسانیت کی نجات
صرف اسلام میں ہے اور انسانیت کیلئے پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ
والسلام کی زندگی ہی صحیح اور مکمل نمونہ ہے

مصنفہ
کاؤنٹ ہنری دی کاستری

عربی ترجمہ
احمد فتحی زاغلول پاشا

اردو ترجمہ
عبدالوہاب ظہوری

نفیس اکیڈمی

بلاسیس اسٹریٹ - کراچی نمبر ۱

قیمت تین روپیہ چار آنہ